

# عاشوراء محرم

روزِ عیدِ یا روزِ غمِ و ماتم؟

یومِ العاشوراء یومِ الفزعِ أمِ الحزنِ؛  
(باللغة الأردیة)

تالیف

شیخ الحدیث حکیم ابوالحسن عبید اللہ رحمانی مبارکپوری رحمہ اللہ

مراجعه :

شفیق الرحمن ضیاء اللہ مدنی

ناشر

دفتر تعاون برائے دعوت و ارشاد و توعیۃ الجالیات ربوہ، ریاض  
مملکت سعودی عرب

[Islamhouse.com](http://Islamhouse.com)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## عاشوراء محرم روزِ عیدِ یارِ روزِ غم و ماتم؟

محرم عربی اسلامی سال کا پہلا مہینہ ہے، جو اللہ پاک کے دین میں سراپا حرمت و عظمت و برکت کا مہینہ ہے۔ اسی طرح قمری سال کے بارہ مہینوں میں رجب، ذوالقعدہ اور ذوالحجہ کے مہینے بھی معظم اور محترم قرار دئے گئے ہیں۔ اسلام چونکہ اللہ کا دین قدیم ہے اس لئے تمام اگلی شریعتوں میں بھی ان چار مہینوں کی حرمت و عظمت مسلم رہی ہے۔

﴿إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِنْدَ اللَّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كِتَابِ اللَّهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرْمٌ ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ فَلَا تَظْلِمُوا فِيهِنَّ أَنْفُسَكُمْ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً كَمَا يُقَاتِلُونَكُمْ كَافَّةً وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ﴾ (التوبة: 36)

”بے شک مہینوں کی تعداد اللہ کے نزدیک کتاب اللہ میں بارہ ہے، اسی دن سے جب سے آسمانوں اور زمین کو اس نے پیدا کیا ہے۔ ان میں سے چار حرمت والے ہیں۔ یہی درست دین ہے۔ پس ان مہینوں میں اپنے اوپر ظلم نہ کرو۔“

عرب جاہلیت کے لوگ جو خود کو دین ابراہیمی کا پیروکار کہتے تھے۔ وہ بھی ان مہینوں کا احترام کرتے تھے۔ اور اس میں باہم قتل و قتال یا لوٹ مار اور اپنے دشمنوں سے انتقام لینے سے اجتناب کرتے اور اگر وہ ان حرمت والے مہینوں میں کبھی قتل و قتال یا لوٹ مار کا ارادہ کرتے تو بھی کم از کم ان مہینوں کی ظاہری حرمت کا لحاظ رکھتے ہوئے ان کی ترتیب

عاشوراء محرم، روزِ عید یارِ روزِ غم و ماتم

③

و تقدیم میں تاخیر سے کام لیتے تھے۔ مثلاً محرم میں قتل و قتل کی ضرورت پیش آگئی تو اپنے سرداروں سے اعلان کر دیا کہ امسال صفر کا مہینہ پہلے اور محرم کا مہینہ اس کے بعد کا ہوگا۔ یعنی محرم کی حرمت کا قرض ماہ صفر میں ادا کیا کرتے تھے۔ ان کے اس عمل کو ”نسیء“ کہا جاتا تھا۔

﴿إِنَّمَا النَّسِيءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ الَّذِينَ كَفَرُوا يُحِلُّونَهُ عَامًا وَيُحَرِّمُونَهُ عَامًا لِيُوَاطُّوا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ فَيَحِلُّوا مَا حَرَّمَ اللَّهُ زَيْنَ لَهُمْ سُوءُ أَعْمَالِهِمْ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ﴾  
(التوبة: 37)

یقیناً ”نسیء“ کا عمل کفر میں زیادتی ہے جس کے ذریعہ کافر لوگ گمراہ کئے جاتے ہیں۔ اسی کو ایک سال حلال کر لیتے ہیں اور دوسرے سال حرام قرار دیتے ہیں تاکہ اللہ کے حرام کردہ مہینوں کی گنتی پوری کریں اور حلال کر لیں اس چیز کو جسے اللہ نے حرام کر دیا ہے ان کے لئے ان کے برے اعمال مزین کر دئے گئے ہیں۔ اور اللہ کافروں کو ہدایت کی توفیق نہیں دیتا۔

یوں تو محرم از اول تا آخر، حرمتوں، برکتوں، اور عظمتوں سے بھرپور ہے لیکن اس کی دسویں تاریخ جسے ”عاشوراء“ کہا جاتا ہے اس کی مستقل ایک شرعی حیثیت ہے کہ اسی روز سعید میں اللہ رب العزت نے جناب موسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام اور قوم بنی اسرائیل کو فرعون کے ظلم سے نجات بخشی تھی چنانچہ حضرت موسیٰ اور ان کی قوم کے مسلمانوں نے اس کو شکرو سپاس اور خوشی کا دن قرار دے کر روزہ رکھا۔ روزہ کا حکم مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کے بعد ہوا۔ رمضان کے روزوں کی فرضیت سے قبل رسول پاک ﷺ اور صحابہ کرام عاشوراء کا روزہ غایت درجہ اہتمام سے رکھا کرتے تھے لیکن رمضان کی فرضیت کے بعد عاشوراء کے

روزوں پر پہلے جیسا اہتمام تو نہ رہا۔ لیکن بذات خود رسول ﷺ نے برابر عاشوراء کا روزہ رکھا۔ مدینہ میں یہود بھی یہ روزہ رکھتے تھے۔ مدینہ میں یہود بھی یہ روزہ رکھتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے ان سے دریافت کیا کہ تم لوگ کیا سمجھ کر یہ روزہ رکھتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ اسی دن اللہ نے حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کو فرعون پر فتح عطا کی تھی۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس دن روزہ رکھا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں زیادہ حقدار ہوں کہ اس شکر و سپاس میں موسیٰ کی ہمنوائی کروں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: (لئن عشت لأصومن التاسع والعاشر) ”اگر میں آئندہ سال بقید حیات رہا تو نویں اور دسویں تاریخ کو روزہ رکھوں گا۔“ اور ایک روایت میں ہے (لأصومن التاسع والعاشر والحادی عشر) ”کہ میں نویں، دسویں، گیارہویں، تاریخ میں روزہ رکھوں گا۔“

یہ رہی اس ماہ مبارک و محترم کی اصل شرعی حیثیت کہ یہ دن اللہ کی نعمت کے شکر و سپاس کا ہے نہ کہ غم و اندوہ اور گریہ و ماتم کا۔ اب یہ ایک علیحدہ بات ہے کہ آئندہ اسی روز سعید کو ۶۰ھ میں ایک انتہائی اندوہناک اور غم انگیز واقعہ کربلا بھی پیش آ گیا جس میں سیدنا حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے تمام اعوان و انصار نے ظالم اور بے رحم دشمنوں کے ہاتھوں شہادت پائی، لیکن عاشوراء کے دن اس واقعہ کربلا کے پیش آ جانے سے اس کی اصل شرعی حیثیت تو نہیں بدل جاسکتی۔ دین و شریعت کی تکمیل تو محمد رسول ﷺ کی حیات پاک میں ہو چکی اور ہر دینی و شرعی چیز کی دینی و شرعی حیثیت بالکل متعین ہو چکی۔ بعد میں پیش آنے والے حالات و واقعات تبدیل نہیں کر سکتے۔

﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتَمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي

وَرَضِيْتُ لَكُمْ الْإِسْلَامَ دِينًا﴾ (المائدة: 3)

”آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت

(شریعت و دین) تمام کر دی۔ اور تمہارے لئے اسلام ی کے دین ہونے پر رضا مند ہو گیا۔“

لہذا عاشوراء محرم الحرام کو اعزازِ اداری، گریہ و ماتم اور سینہ کوبی سے تبدیل کرنا سراسر دین و شریعت پر ظلم و بے راہ روی اور بے دینی ہے۔ اہل اسلام کو ایسی لغو اور بے ہودہ رسموں سے پرہیز لازم ہے۔ جب احکام الہی کا پاس و لحاظ اٹھا دیا جائے تو محبت رب اور رسول کے کیا معنی ہیں؟ اور جب رسول کی رسالت ہی کا پاس و احترام باقی نہ رہا تو رسول کے اہل بیت سے دعویٰ محبت کیا چیز رہی؟ سیدنا امام حسینؑ نواسہ رسول ہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، لہذا اشرف رسالت، اللہ کی نسبت سے ہے جب اللہ نہیں تو رسول کس کا؟ اور جب رسول نہیں تو اہلیت کس کے؟ اور اللہ اور اس کے رسول پر ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ جس دین اور شریعت کو اللہ نے اپنے رسول کی معرفت بھیجا ہے۔ اس کا پوری طرح پاس و لحاظ کیا جائے۔

یوم عاشوراء اسلامی تاریخ میں خوشی اور شکر کا دن قرار دیا گیا ہے۔ اب ہمیشہ یہ دن اسلام کی نظر میں خوشی اور شکر کا ہی دن رہے گا۔ جیسے عید الفطر و عید الاضحیٰ کے ایام خوشی اور شکر کے دن قرار دئے گئے۔ لہذا ان ایام کو گریہ و ماتم ورنج و الم کے ایام قرار دینا سراسر کفرانِ نعمت ہے خواہ وہ ان میں کیسا ہی غم انگیز حادثہ رونما ہو جائے۔ لیکن ان ایام کی مستقل حیثیت وہی رہے گی جو اسلام نے ٹھہرائی ہے۔ بعض مشترک اقوام اپنے مذہبی تہواروں میں اپنے کسی عزیز کے فوت ہو جانے پر چند سالوں تک خوشی نہیں مناتے لیکن وہ بھی مستقل طور پر ہمیشہ کے لئے ان تہواروں کو غم کا دن قرار نہیں دیتے۔ بلکہ ان کی اصلی حیثیت کے مطابق ان کو خوشی کا دن ہی سمجھتے۔ لیکن افسوس کہ امت مسلمہ کے ایک طبقہ نے یوم عاشوراء کو مستقل طور پر غم و الم کا دن قرار دیا ہے۔

### شہداء کربلا پر ماتم کیوں؟

حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی سن ۶۰ھ میں کربلا کے مقام پر ظلماً شہید کئے گئے۔ اگر ہم واقعتاً انہیں شہید جانتے اور مانتے ہیں اور اس قرآنی حقیقت پر ہمارا یقین ہے کہ جو لوگ راہ اللہ میں مارے جاتے ہیں وہ مردہ نہیں زندہ ہیں اور اپنے رب کے نزدیک روزی پاتے ہیں (القرآن) تو ان پر سال بہ سال نوحہ خوانی اور گریہ و ماتم کیا معنی رکھتا ہے؟ کیا رسول پاک کے ہمراہ بدر و حنین میں لڑ کر شہید ہونے والوں میں سے کسی ایک پر بھی گریہ و ماتم کی ضرورت آئیں حضرت ﷺ کی زندگی میں یا آپ کے بعد سچی گئی؟ اگر نہیں تو کیوں؟

اسی لئے تو کہ وہ زندہ ہیں اور زندوں کیلئے گریہ و ماتم نہیں کیا جاتا۔ اور گریہ کہا جائے کہ جنگ و بدر واحد کے شہداء کفار و مشرکین کے ہاتھوں قتل ہوئے اور امام حسین اور ان کے ساتھی نام نہاد مسلمانوں کے ہاتھوں قتل کئے گئے تو حضرت عثمان و علی و حسن رضی اللہ عنہم بھی تو نام نہاد مسلمانوں ہی کے ہاتھوں شہید ہوئے تو ان پر گریہ و ماتم کیوں نہیں کرتے؟ کیا اسلامی غزوات کی تاریخ میں کوئی ایک بھی شہادت رسول پاک ﷺ کی زندگی میں یا آپ کے بعد ایسی نہ تھی کہ اسکے لئے آنسوؤں کے چند قطرے بہائے جاتے؟ کیا دور رسالت کے شہداء جن کی شہادت کی تصدیق قرآن پاک نے کر دی ہے وہ بھی اس لائق نہیں تھے؟ ضرور اس لائق تھے لیکن دین اسلام میں شہادت مومن کے لئے ایک اعزاز و انعام ہے مصیبت و غم نہیں، اللہ پاک نے شہادت کو شہداء پر اپنا ایک

عظیم انعام و احسان قرار دیا ہے۔ جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے: ﴿إِنْ يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهُ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاءَ﴾ (آل عمران: 140)

”اگر تم زخم ہوئے ہو تو تمہارے مخالف لوگ بھی ویسے ہی زخمی ہو چکے ہیں اور تکلیف اور شدائد کے ان دنوں کو ہم لوگوں کے درمیان پلٹتے رہتے ہیں اور ایسا اسلئے بھی ہوتا ہے تاکہ اللہ ایمان والوں کو جان لے اور تم میں سے کچھ لوگوں کو شہادت عطا فرمادے۔“

پس جب مومن کیلئے شہادت اللہ کا عطیہ اور گرانقدر بخشش ہے تو اس پر گریہ و ماتم کرنے والے دشمن ہی ہو سکتے ہیں دوست نہیں ہو سکتے۔ یا پھر پوری تاریخ اسلام سے کم از کم ایک ہی مثال پیش کی جائے کہ کسی بھی شہید اسلام کیلئے یہ طریقہ روا رکھا گیا ہے۔

شریعت اسلامی کی رو سے تو عام اموات پر بھی تین دن سے زیادہ سوگاری جائز نہیں، صرف عورت کو اپنے خاوند کیلئے چار ماہ دس دن تک سوگ کر سکتی ہے۔

لیکن نوحہ خوانی اور ماتم کی تو سرے سے اسلام میں کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے: (لیس منا من ضرب الخدود و شق الجيوب و دعى بدعوى الجاهلية) ”وہ شخص ہم میں سے نہیں جو اپنے رخساروں کو پیٹے اور گریبانوں کو پھاڑے اور عہد جاہلیت کا آوازہ بلند کرے۔ یعنی واویلا پکارے“ (بخاری و مسلم)

نیز آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (النِّياحَةُ من عمل الجاهلية) ”

نوحہ خوانی جاہلیت کے دور کا عمل ہے۔ لہذا تذکرہ شہادت حسین کے ساتھ نوحہ خوانی، ماتم و گریہ کی رسم جسے حُب حسین اور حُب اہل بیت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ سراسر حسین کے نانا جان کے حکم کی صریح خلاف ورزی ہے اور شریعت اسلامی کی رو سے بدعت و ضلالت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کم از کم اہل سنن کو جنہیں پیروی سنت رسول کا دعویٰ ہے اس بدعت سے باز آ جانا چاہیے۔

اول تو اس تاریخی دن میں رسول پاک ﷺ اور آپ کے آل و اصحاب سے روزہ رکھنے کے سوا کوئی دوسرا عمل یا کسی تقریب کا انعقاد ثابت نہیں۔ لیکن اس دن کی شرعی حیثیت کی مناسبت سے اگر کوئی تذکرہ موزوں اور مناسب بھی ہو سکتا ہے تو وہ جہاد موسوی اور فرعون و آل فرعون پران کو غلبہ عطا کئے جانے کا۔ نہ کہ تذکرہ شہید کربلا۔ واقعہ کربلا اپنی جگہ کتنا ہی اہم سہی۔ اسکے تذکرہ کے اور بھی مواقع ہو سکتے ہیں لیکن عاشوراء کی شرعی حیثیت سے اسے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ لہذا یوم عاشوراء سے اس بدعت کو ختم کیا جانا چاہیے۔

واقعات کربلا پر بھی ایک سرسری نظر

واقعات کربلا کو اگر اسکے پس منظر و پیش منظر میں دیکھا جائے تو اسکی ذمہ داری ایک ایسے اسلام دشمن سازشی گروہ کے سر آتی ہے جسکی اسلام دشمنی سے آج تک ملت اسلامیہ اور امت محمدیہ کو ایک امت اور ایک ملت بکمر رہنا نصیب نہ ہو سکا۔ اور دنیا بھر کی اسلامی حکومتوں کا شیرازہ آج تک یہی سازشی گروہ بکھیرتا چلا آ رہا ہے۔ اور اگر ان واقعات کو اسکے پس



منظر اور پیش منظر سے کاٹ کر دیکھا جائے کہ وہ یزید بن معاویہ کے عہد میں پیش آئے لہذا وہی ان تمام واقعات کا ذمہ دار بھی ہے تو اسکی تان خلفاء ثلاثہ ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ اور معاویہؓ اور اصحاب رسول ﷺ پر جا کر ٹوٹے گی۔ کیونکہ یزید کیلئے بیعت خود معاویہؓ نے اپنی زندگی میں اپنے ارباب شوری کے مشورہ سے لی تھی۔

اور معاویہ کو شام کا گورنر حضرت عمر فاروقؓ نے مقرر کیا تھا۔ اور حضرت عثمانؓ نے ان کو اپنے دورِ خلافت میں اس منصب پر فائز رکھا تھا۔ اور حضرت عمرؓ کو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے ارباب شوری کے مشورہ سے خلیفہ نامزد کیا تھا، اور تمام مسلمانوں نے ابوبکر و عمر و عثمان کی خلافت کو تسلیم کیا تھا۔ اور پھر حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد تمام صحابہ و اہل بیت اور بنو ہاشم نے حضرت معاویہ کی خلافت کو بھی تسلیم کر لیا تھا۔ لہذا درجہ بدرجہ تمام صحابہ و اہلبیت کو اس ظلم میں حصہ دار قرار دیا جائے گا۔ نعوذ باللہ من ذالک۔ اور یہی بات تو آج کے شیعانِ علی (جو دراصل شیعانِ علی نہیں بلکہ سبائی ہیں) کھلے لفظوں میں یہ پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ ”معاذ اللہ“ دشمنانِ اسلام ابوبکر و عمر و عثمان اور معاویہ نے وصی رسول اللہ ”حضرت علی“ سے ان کا حقِ خلافت چھین لیا تو ظالم اور جاہرِ خلافتوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا جو ۶۰ھ میں پورے خاندانِ نبوت کے قتل پر منج ہوا۔ وہ اسی لئے تو خلفاء ثلاثہ ابوبکر و عمر و عثمان پر اور معاویہ پر لع طعن اور تبراؤ تولی کرتے ہیں اور اہل سنن ”جو صحابہ اور اہل بیت دونوں سے محبت کرتے ہیں اور عقیدت رکھتے ہیں“ کے اس موقف کو کھلے ہوئے تضاد اور نامعقولیت پر مبنی قرار دیتے ہیں کیونکہ دوست کا دشمن، دشمن ہوتا ہے دوست نہیں ہو سکتا۔ لہذا علی اور اہلبیت سے محبت کا تقاضا یہ ہے کہ ان سے حقِ خلافت چھیننے والوں کو دشمن قرار دیا جائے۔ علی وصی رسول اور خلیفہ رسول بلا فصل تھے ان سے پہلے ابوبکر نے

اور پھر عمر نے پھر عثمان نے حق خلافت چھینا اور چوتھے نمبر پر اصحابِ مدینہ نے انھیں خلافت تسلیم بھی کیا تو اہل مکہ و اہل بصرہ و شام نے ان کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا اور خود عائشہ نے جنگِ جمل میں باغیوں کی قیادت کی۔ لہذا اہلسنت کے موقف کا کھلا تضاد یہ ہے کہ وہ عائشہ، طلحہ، زبیر اور معاویہ کو بھی رضی اللہ عنہم کہتے ہیں اور حضرت علی کو اور امام حسین و امام حسن کو بھی رضی اللہ عنہم کہتے ہیں جبکہ مسئلہ خلافت میں ان کے درمیان جمل و صفین کی دو خونریز جنگیں ہوئیں۔ لیکن ہم شیعانِ علی جو مجہن اہلبیت ہیں اور اہل بیت پر درود و سلام پڑھتے ہیں ان کے ان دشمنوں پر کھل کر لعنت کرتے ہیں۔ پس ہمارا یہ موقف عدل و انصاف اور معقولیت پر مبنی ہے۔ علی اور اہلبیت کا پہلو وہ اس طرح بچاتے ہیں کہ انہوں نے صدق دل سے نہیں بلکہ بطورِ ترقیہ ان ظالموں اور غاصبوں کی خلافت تسلیم کیا تھا۔

اہل سنت بھائیوں کا عقیدہ

آپ حضرات کا کھلا عقیدہ یہ ہے کہ تمام صحابہ اور اہل بیت حق پر تھے اور وہ سب کے سب جنتی ہیں۔ معصوم تو صرف ذات رسالت تھی۔ امتی معصوم عن الخطا نہیں ہو سکتا، لہذا جتھا دی خطا تو ان میں سے کسی سے بھی ممکن ہے، لیکن دانستہ گمراہی کا راستہ اختیار نہیں کر سکتے۔ ہرگز رسول پاک ﷺ نے اپنے بعد کے لئے کسی صحابی یا اہل بیت کو اپنا وصی یا خلیفہ بلا فصل نامزد نہیں کیا بلکہ امت کو قرآن دیا اور قرآن پاک صاف لفظوں میں خلافت و امارت کی بابت ایک رہنما اصول و ضابطہ دیتا ہے۔ ﴿وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ﴾ (الشوری: 38) ”مسلمانوں کا (ہر) کام آپس کے مشورے سے ہوتا ہے“ اسی قرآنی رہنما اصول کے مطابق ابو بکر و عمر و عثمان کی خلافت کو ان کے ادوار میں تمام صحابہ و اہلبیت نے تسلیم کیا کسی ایک فرد کو بھی ان کی خلافت تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہ ہوا۔

## قتل عثمان اور خلافت علی

حضرت علی کی خلافت، ہنگامہ قتل عثمان کے بعد ہوئی اور فوری طور پر جائے خلافت کو پر کر دینے کی ضرورت پیش آئی تاکہ مبادا کہیں قاتلین عثمان ہی امر خلافت پر قبضہ نہ جمالیں اور پھر تمام مسلمانوں پر مظالم کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جائے۔ اسی لئے مدینہ کے ”مہاجرین و انصار“ نے ان کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کر لی اور اہل مکہ و اہل بصرہ و اہل شام کو خلیفہ کے انتخاب کے وقت مشورہ میں شامل نہ کیا جاسکا۔ پھر ان دشمنان اسلام سبائیوں نے ”جنھوں نے حضرت عثمان کو ایک طویل محاصرہ کے بعد شہید کر دیا تھا۔ قصاص عثمان سے بچنے اور مسلمانوں کی صفوں میں انتشار ڈالنے کیلئے بڑھ بڑھ کر حضرت علی کے ہاتھ پر امارت کی بیعت کر لی، انہوں نے اپنے نعرہ بازیوں اور ہنگامہ خیزیوں سے مدینہ کے پرامن مسلمانوں کو اس قدر خوفزدہ کیا کہ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا تک کیلئے مدینہ کی سرزمین پر سکون و قرار ناممکن ہو گیا اور وہ راتوں رات نکل کر مکہ چلی گئیں، حضرت علی کے دور فتنہ اور مشیران خاص حضرت طلحہ اور زبیر بھی مدینہ چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ حضرت عائشہ نے اپنی مکہ کی تقریر میں ان تمام حالات و واقعات کا صاف صاف تذکرہ کیا جن میں مختلف صحابہ کرام اور خود ان کو مدینہ ترک کرنا پڑا۔ انہوں نے سبائی شورش پسندوں کی خوف و دہشت پھیلانے کی تمام کوششوں کو بے نقاب کیا، اب شکوک و شبہات کا دلوں میں پیدا ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ یہ شبہات حضرت علی سے متعلق نہ تھے، ان کی صالحیت اور صلاحیت پر مسلمانوں کو پورا اعتماد تھا بلکہ ان کی سبائی مبایعین کی جانب سے تھے کہ آیا انہوں نے دل سے علی کی بیعت کو قبول کیا ہے یا صرف تخریب کاری اور عام مسلمانوں کے خلاف ریشہ دوانی کے مقصد سے بیعت کی ہے کیونکہ وہ قتل عثمان اور بیعت علی کے بعد بھی اپنی تخریبی کارروائیوں میں اور خوف و دہشت کی فضا عام کرنے

میں مصروف تھے اور بظاہر ایسا نظر آ رہا تھا کہ انہوں نے عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کے بعد علی رضی اللہ عنہ کو بھی اپنے زرعے میں لے لیا ہے اور وہ انکی منظم قوت کے سامنے بالکل بے بس اور مجبور و محصور ہو کر رہ گئے۔ قاتلین عثمان کا سرگروہ مالک اشترنگی تلوار کے سایہ میں ایک ایک صحابی رسول کو طلب کر کے جبراً علی کی بیعت کا مطالبہ کر رہا تھا گو نام کیلئے یہ علی کی حمایت تھی لیکن درپردہ ایک خطرناک قسم کی تخریب کاری تھی اور اسکی انتہا یہ تھی کہ طلحہ اور زبیر اور عبد اللہ ابن عمر جیسے علی کے رفیقان خاص کو بیعت کیلئے طلب کیا گیا۔ طلحہ اور زبیر سے مالک اشتر نے کہا کہ فوراً امام کی بیعت کرو ورنہ تلوار کی ایک ہی ضرب سے سر کے دو ٹکڑے کر دئے جائیں گے۔ چنانچہ دونوں حضرات نے بیعت کیلئے اپنا ہاتھ بڑھا دیا لیکن عمر فاروق کے بیٹے حضرت عبد اللہ بن عمر اڑ کر کھڑے ہو گئے اور کہا کہ ابھی تو بہت سے مسلمانوں کی بیعت ہونا باقی ہے جب وہ بیعت کر لیں گے تو میں بھی کر لوں گا۔ مالک اشتر نے تلوار اٹھانی چاہی تو حضرت علی نے اسے یہ کہہ کر روک دیا کہ یہ شخص طبعاً ضدی ہے اس طرح رعب سے بیعت کرنے والا نہیں۔ طلحہ اور زبیر نے مکہ جا کر بیعت توڑ دی کیونکہ وہ برضا و رغبت نہ تھے بلکہ جبراً لئی گئی تھی۔

### قصاص عثمان کا مطالبہ

اہل مکہ و اہل بصرہ نے مدینہ کی صورت حال کو طلحہ و زبیر اور ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی زبانی سنا تو وہ شدید انتشار ذہنی و اضطراب قلبی میں مبتلا ہو گئے۔ ایک طرف حضرت علی کی خلافت پر انھیں پورا اعتماد تھا تو دوسری طرف سبائیوں کی منظم سورش اور تخریب کاری سے سخت پریشانی اور ہیجانی کیفیت میں مبتلا ہو گئے تھے، وہ اس اندیشہ میں بالکل حق بجانب تھے کہ اگر قوت و طاقت علی کے ہاتھ میں ہے تو قصاص عثمان بھی لے لیں گے اور حالات کو بھی معمول پر لے آئیں گے۔ لیکن اگر تمام تر قوت ان قاتلین عثمان

(سبائیوں) کے منظم گروہ کے ہاتھوں میں ہے تو ان کی سورش سے نہ تو خود علی محفوظ رہ سکیں گے اور نہ انکے مباحثین صحابہ و اہل بیت۔ اور عثمان کے بعد خاندان عثمان کا انجام تو کسی بھی صورت عثمان کے انجام سے مختلف نہ ہوگا۔ لہذا صورت حال کی وضاحت کیلئے ان کے نزدیک اسکے سوا کوئی اور ممکن صورت ہی نہ تھی کہ علی کے ہاتھ پر اپنی بیعت کو قصاص عثمان پر موقوف کر دیں۔ کیونکہ حضرت علی کے ہاتھ پر ایک جم غفیر بیعت کر چکا تھا، اور اگر یہ بیعت خلوص نیت اور مع و طاعت کے جذبہ کے تحت تھی تو یہ امر چنداں دشوار اور دقت طلب نہ تھا کہ ان گنتی کے ۵۷ نفر سے ”جو براہ راست قتل عثمان میں ملوث تھے“ قصاص لے لیا جاتا۔ اور اگر قاتلین عثمان کی نیت کچھ اور تھی اور وہ صرف حضرت علی کو مسلمانوں کے سامنے لا کر اور ان کو آڑ بنا کر کوئی نیا خونئی ڈرامہ کرنا چاہتے تھے تو حضرت علی ان سے قصاص لینے پر کسی صورت قادر نہیں ہو سکتے تھے اسی خیال کے پیش نظر انہوں نے قصاص عثمان کا مطالبہ کیا تھا۔ یہ صرف مطالبہ قصاص نہ تھا بلکہ سبائیوں کی نیت و ارادوں کو جاننے اور پرکھنے کیلئے ایک جانچ بھی تھی۔ حضرت علی بھی بلوائیوں کی سورش اور انکی بدنیتی اور غلط ارادوں سے بالکل بے خبر نہ تھے۔ لہذا وہ چاہتے تھے کہ جب اس پر آشوب دور میں خلافت قبول کرنے کی ذمہ داری ان کے سر پر ڈالی گئی ہے تو جس طرح ان قاتلین عثمان نے اپنی نیک نیتی اور خلوص ظاہر کر کے علی کی بیعت کر لی ہے اسی صورت اہل مکہ و اہل بصرہ و اہل شام بھی بیعت کر لیں تاکہ اگر بلوائیوں کی طرف سے کوئی نئی سورش پیا ہو تو صحابہ کی منظم قوت سے اسے پکلا جاسکے۔ لیکن ایسی نازک صورت حال میں مسلمانوں کیلئے کوئی قطعی فیصلہ آسان نہ تھا۔ ظاہری صورت حال جو طلحہ و زبیر اور عائشہ صدیقہ کی زبانی سنی گئی تھی انتہائی پریشان کن تھی۔ بلوائی اپنی منظم قوت اور بالادستی کا کھلا مظاہرہ کر رہے تھے اور مسلمانوں کو بری طرح ہراساں کر رہے تھے۔

جب اہل مکہ اور اہل بصرہ نے بیعت سے قبل قضاص عثمان کا مطالبہ کر دیا تو حضرت علی کے لئے انتہائی پریشان کن صورتحال پیدا ہو گئی ایک طرف انکی اپنی مجبوری بھی تھی کہ مطالبہ بیعت سے چشم پوشی نہیں کر سکتے تھے اور دوسری طرف اہل مکہ و بصرہ اندر ہجرتی واضطرابی کیفیت کو بھی وہ پوری طرح محسوس کر رہے تھے۔

”نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن“

حضرت علی نے خود اپنی رضا و رغبت سے تو امارت سنبھالی نہ تھی انھوں نے تو مدینہ کے اصحاب رسول، مہاجرین و انصار کے اصرار پر یہ ذمہ داری قبول کی تھی کہ اسلام میں جائے خلافت کو خالی چھوڑنے کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔ مسلمانوں کی زندگی کا کوئی گوشہ امیر و امام کی سمع و طاعت سے خالی نہ رہنا چاہئے۔ پھر اس بات کا بھی شدید امکان کہ یہی قاتلین عثمان خلیفہ سوم کو قتل کرنے کے بعد اپنے ہی میں سے کسی کو امیر و امام بنا کر دار الخلافہ (مدینہ) پر قبضہ نہ کر لیں۔ ایک مسلح جم غفیر کی موجودگی میں اس بات کا بھی تو موقع نہ تھا کہ اہل شام و اہل مکہ و بصرہ کو انتخاب خلافت کی دعوت دی جاتی، خود اہل مدینہ بلوایوں کی طاقت کے سامنے مجبور تھے۔ اسی لئے وہ اپنے خلیفہ عثمان کی طرف سے مدافعتانہ جنگ بھی نہ کر سکے۔ اسی نازک صورتحال کے پیش نظر علیؑ نے امارت کو قبول کر لیا تھا۔ ورنہ وہ کہتے تھے کہ حضرت عثمانؓ کے اس طرح مظلومانہ قتل کے بعد بلاشورائیت عامہ ان کی امارت مشکوک اور اختلاف سے محفوظ نہ رہ سکے گی۔ اور اسی لئے وہ قتل عثمان کے وقت باہر چلے گئے تھے۔ لیکن جب اس نازک اور پر آشوب دور میں خلافت کی ذمہ داری ان کے سپرد کی گئی اور انھوں نے اسلام اور اہل اسلام کی مصلحتوں کے پیش نظر اسے قبول کر لیا تو اب مسلمانوں سے سمع و طاعت کی بیعت لینا ان کے ابتدائی اور اہم ترین منصبی فرائض میں سے تھا۔ دوسری طرف مدینہ کی خبر سے دور دراز علاقوں کے مسلمانوں کے دلوں میں جو خدشات پیدا ہو رہے

تھے وہ بالکل قدرتی تھے۔

یعنی یہ کہ جب حضرت علی اور تمام اہل مدینہ ان ہزاروں مسلح بلوائیوں سے خلیفہ سوم کو نہ بچا سکے اور انکے مقابلہ میں خود کو مغلوب و کمزور پایا تو اب حضرت علی کو انھیں اہل مدینہ کی بیعت سے بلوائیوں پر غلبہ کس طرح حاصل ہو سکتا ہے۔ غلبہ تو اسی صورت حاصل ہو سکتا ہے جب قتل عثمان کے بعد بلوائی علی کی بیعت سمع و طاعت پر صدق دل سے آمادہ ہو گئے ہوں اور اسکی آزمائش کا واحد راستہ قصاص عثمان کا مطالبہ ہو سکتا تھا ورنہ قرآن کے حکم ﴿وَ خُذُوا حِذْرَکُمْ﴾ (النساء: 102) ”دشمن سے اپنی احتیاط اور چوکسی کو لازم پکڑو“ کے مطابق دور دراز کے مسلمانوں کیلئے یہ کسی طرح لائق و مناسب ہی نہ تھا کہ بلا سمجھے بوجھے بیعت امام کے عنوان سے خود کو بلوائیوں کی مسلح قوت کے حوالہ کر دیتے۔ خود حضرت علی کو اس مطالبہ کی صحت اور اسکے پس منظر کی معقولیت کا پوری طرح احساس بھی تھا۔ لیکن وہ سردست اس پر قادر نہ تھے کہ عثمان کے قاتلوں سے قصاص دلوا سکتے۔ یہی مطالبہ معاویہ کا بھی تھا کہ علی قاتلین عثمان سے قصاص دلوائیں تو اہل شام ان کی بیعت کو قبول کر لیں۔ معاویہ کا یہ مطالبہ حضرت علی نے چار ماہ کی مہلت کے ساتھ تسلیم بھی کر لیا تھا۔ لیکن چار ماہ بعد جب حضرت علی نے سمجھا بجا کرتا قاتلوں کو قصاص کیلئے معاویہ کے حوالے بھی کرنا چاہا تو بیس ہزار سبائی شمسیر بکف ہو کر حضرت کے روبرو مظاہرہ کرنے لگے ”ہم سب قاتلین عثمان ہیں اگر قاتلین عثمان کو معاویہ کے حوالے کرنا ہے تو ہم سب کو اسکے حوالے کر دو“ اس مظاہرہ سے حضرت علی دم بخود رہ گئے اور اچھی طرح سمجھ لیا کہ بلا مکہ و بصرہ و اہل شام کی بیعت کے وہ قصاص عثمان پر قادر نہیں ہو سکتے۔ دوسری طرف قاتلین عثمان انھیں اس بات پر مجبور کر رہے تھے کہ آپ ایسے لوگوں کے مطالبہ قصاص پر مطلقاً کان نہ دھریں اور اگر وہ بلا قید و شرط آپ کی بیعت نہ کریں تو آپ بہ نوک شمشیر ان سے بیعت کا مطالبہ کریں

اور پہلے بیعت معاویہ اور اہل شام سے لی جائے اسلئے کہ عثمان کے ولی اقرب معاویہ ہی تھے۔ اگر وہ بلا قید و شرط بیعت کر لیتے، یا مطالبہ قصاص ترک کر دیتے تو اہل مکہ و اہل شام بھی بلا قید و شرط بیعت کر لیتے۔ لیکن معاویہ کس طرح قصاص عثمان سے دستبردار ہو سکتے تھے اگر معاملہ تھا ان کی اپنی بیعت کا ہوتا تو یہ ممکن بھی تھا کہ وہ ایسا کرتے لیکن ان بلوایوں نے تو دیدہ و دانستہ صورت حال کو اس درجہ قابو سے باہر کر دیا تھا اور اہل شام کے جذبات انتقام کو اس قدر برا بیچتہ کر دیا تھا کہ ایسا کرنا خود معاویہ کے قدرت و اختیار سے بھی باہر تھا۔ جس طرح قاتلوں سے قصاص لینا علی کے اختیار سے باہر تھا۔ بھلا یہ خون آلود قمیص عثمان اور بی بی نائلہ کا کٹا ہوا ہاتھ مدینہ سے شام کس طرح پہنچ گیا؟ کہ اسے جب اہل شام نے دیکھا تو کہرام مچ گیا؟ وہاں کے علماء اور مشائخ نے قسم کھائی کہ جب تک خلیفہ مظلوم کے قاتلوں سے انتقام نہ لے لیں گے نہ راتوں کو بستر پر سوئیں گے نہ زینت اور خوشبو کا استعمال کریں گے۔ مظلوم خلیفہ کی تجہیز و تکفین تو حضرت علی کی خلافت میں ان کے تحت امر ہوئی تھی۔ پھر خلیفہ کی خون آلود قمیص اور بیوی نائلہ کا کٹا ہوا ہاتھ کس نے اور کس مصلحت کے پیش نظر شام پہنچایا تھا؟ کیا کوئی شام سے مدینہ آیا تھا جو اپنے ساتھ قمیص عثمان اور نائلہ کا ہاتھ لے گیا؟ نہیں بلکہ یہ انھیں ظالم سبائیوں کی شرانگیزی تھی جو ایک طرف حضرت علی کو معاویہ و اہل شام سے بہنوک شمشیر بیعت لینے پر آمادہ کر رہے تھے تو دوسری طرف اہل شام کو قصاص عثمان کیلئے بھڑکار رہے تھے۔

## جنگِ جمل

اب مکہ و بصرہ چونکہ شام کی بہ نسبت مدینہ سے زیادہ قریب تھے اور اندیشہ تھا کہ اگر شام کی طرف پہلے پیش قدمی کی گئی تو وہ معرکہ زیادہ سخت اور خونریز ہوگا اور اس دوران اس بات کا بھی احتمال تھا کہ اہل مکہ و بصرہ کہیں دار الخلافہ مدینہ پر قبضہ نہ کر لیں لہذا مناسب



یہی سمجھا گیا کہ شام سے پہلے بصرہ کی طرف پیش قدمی کی جائے۔ حضرت ام المومنین رسول ﷺ کی انتہائی محبوب اور قابل اعتماد بیوی تھیں وہ بھی بصرہ پہنچ چکی تھیں۔ ظاہر ہے کہ صحابہ کرام ناموس رسالت کیلئے اپنے خون کا آخری قطرہ بہانے سے دریغ نہیں کر سکتے تھے۔ خدا نخواستہ اگر ام المومنین اس معرکہ میں قتل ہو گئی ہوتیں یا شدید زخمی ہو جاتیں تو مسلمانوں کے جذبات کو روکے تھامے رہنا ممکن نہ ہو سکتا۔ چنانچہ اسی خیال کے پیش نظر حضرت علی نے اپنا ایک قابل اعتماد قاصد حضرت عائشہ اور حضرت طلحہ وزبیر کی خدمت میں روانہ کر دیا، اسنے پہلے مائی عائشہ کی خدمت میں حاضری دی اور دریافت کیا: ”امی جان آپ یہاں کس مقصد سے تشریف فرما ہوئیں؟“ مائی جان نے جواب دیا: ”بیٹے مسلمانوں میں بچاؤ اور اصلاح کی غرض سے حاضر ہوئی ہوں“ پھر قاصد نے طلحہ وزبیر سے ملاقات کی اور دونوں حضرات کو اس بات پر رضامند کر لیا کہ وہ سردست مطالبہ قصاص عثمان کو ترک کر دیں گے اور حضرت علی سے بات چیت کر کے بیعت قبول کر لیں گے۔ اس وقت حضرت علی کو فہ پہنچ چکے تھے اس دوران عبداللہ بن سبأ یہودی جو بظاہر اسلام قبول کر چکا تھا اور جس نے سرزمین عرب کے تمام صوبوں (صوبہ شام کے علاوہ) اسلامی خلافت کے نظام کو درہم برہم کرنے اور مسلمانوں کو آپس میں ٹکرا ٹکرا کر کے ختم کرنے کا منصوبہ پھیلا دیا تھا۔ بذات خود کوفہ میں موجود تھا اسنے اپنے گروہ کے سرکردہ لوگوں کی ایک خفیہ میٹنگ کی اور کہا کہ اگر طلحہ اور زبیر اور علی کے حامیوں (شیعان علی) کے مابین یہ نزاع ختم ہو گئی اور انکی آپس میں صلح طے ہو گئی تو ہماری خیر نہیں۔ لہذا ہمیں چاہئے کہ (شیعان علی) سے ہم اپنی رفاقت اور دوستی پوری طرح نبھائے رکھیں اور بظاہر کسی امر میں ان کی کھل کر مخالفت نہ کریں لیکن کل جب علی اور انکے ساتھی بصرہ صلح کی بات چیت کرنے جائیں تو رات کے پچھلے پہر ہم لوگ بصرہ کی سرحد پر ایک زوردار حملہ کر دیں اور شور مچائیں کہ بصرہ کی فوج نے کوفہ

کے اندر داخل ہو کر ہم پراچانک حملہ کر دیا جس کو ہم نے بالکل پسپا کر دیا اور حملہ آوروں کو ان کی سرحد میں واپس دھکیل دیا اور سرحد ہی سے ہمارا ایک شخص جا کر علی کی مجلس میں ان سے کچھ فاصلہ پر جا بیٹھے اور جب وہ شور و ہنگامہ سن کر دریافت کریں کہ کیا معاملہ ہے تو وہ ان کو ہمارے منصوبے کے مطابق آگاہی دے کہ بصرہ کی فوج نے کوفہ کے اندر داخل ہو کر ہم پر پے اچانک حملہ کر دیا جسے ہم نے سرحد تک پسپا کر دیا۔ اور حملہ آوروں کو سرحد کے اندر دھکیل دیا اور جب بصرہ کی سرحدی چوکی والوں نے ہم پر پلٹ کر دوبارہ جوابی حملہ کیا تو ہمارے ساتھی رات کی تاریکی میں منتشر ہو گئے اور مجھے واپس جانے کا موقع اور راستہ نہ مل سکا تو میں یہاں آپ کی مجلس میں آ بیٹھا اور جب طلحہ وزیر کو اس شور و ہنگامہ کی آواز سنائی دے گی اور ان سے لوگ کہیں گے کہ کوفہ والوں نے بلا کسی اشتعال کے ہم پر حملہ کر دیا ہے تو علی اور طلحہ وزیر اور ان کے حامیوں کے مابین اعتماد خود بخود ختم ہو جائے گا اور جنگ کی آگ بھڑک اٹھے گی اور جبر کا حامی اور ساتھی ہے اس کی حمایت میں لڑنے کیلئے اٹھ کھڑا ہوگا اور صلح کی بات چیت اور اس کا امکان ختم ہو جائے گا۔

حضرت علی قاصد کے اس پیغام سے بہت خوش اور مطمئن ہوئے تھے اور انہوں نے اعلان کیا تھا کہ کل ہمارے ساتھ مصالحت کی بات چیت کے سلسلے میں ایسے دو اشخاص ہرگز نہیں جائیں گے جو کم عقل جذباتی اور ہنگامہ پسند ہیں۔ انہوں نے صلح کی بات چیت میں شرکت کیلئے اپنے اعتماد کے لوگوں کو چن لیا تھا ان کے اسی اعلان سے سبائیوں کا ماتھا ٹھنکا تھا کہ مصالحت اگر واقع ہوئی تو ہماری خیر نہیں۔ علی بہر حال خلیفہ مظلوم کا قضا لے کر رہیں گے اور پھر ہماری قیل و قال کوئی سننے والا نہ ہوگا۔ اسلئے انہوں نے عین اس وقت کہ جب بات چیت بڑے خوشگوار ماحول میں جاری تھی اور دونوں فریق سفیر کے ذریعہ صلح کی بات چیت کو آگے بڑھاتے جا رہے تھے اور جب اس بات کے نمایاں آثار پائے جا رہے

تھے کہ ام المومنین عائشہ اور طلحہ وزبیر اور اہل بصرہ قصاص عثمان سے قبل علی کی بیعت پر رضامند ہو جائیں گے۔ اچانک رات کے پچھلے پہر شور اور ہنگامہ اور جنگی نعروں کی آواز گونجی۔ طلحہ اور زبیر نے دریافت کیا کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ تو جواب دیا گیا کہ ابھی کوفہ کی فوج نے بصرہ کی سرحد پر حملہ کر دیا ہے تو انہوں نے ”انا للہ“ کہا اور کہا کہ علی مسلمانوں کے مابین خونریزی کرا کے ہی دم لیں گے۔ اسی طرح جب علی نے یہ شور و ہنگامہ سنا تو دریافت کیا کہ کیا بات ہے؟ پھر جب اس شخص نے جسے ایک سازش کے تحت انکے پاس بھیجا گیا تھا انہیں خبر دی کہ بصرہ کی فوج نے رات کو اچانک حملہ کر دیا تو حضرت علی نے ”انا للہ“ کہا اور کہا کہ طلحہ وزبیر مسلمانوں میں خونریزی کرا کے ہی دم لیں گے۔ چنانچہ اسی وقت ہر دو فریق کے مابین انتہائی خونریز جنگ بھڑک اٹھی۔ حضرت عائشہ ہودج میں بیٹھی اونٹ پر سوار تھیں اور انکے اونٹ کے گرد مسلمانوں کے لاشوں کے انبار لگ گئے تھے۔ دشمنان اسلام کو کبار صحابہ کوچین چن کر قتل کرنے کا موقع مل گیا۔ انہوں نے خاص طور پر ایسے ہی افراد کو نشانہ بنایا جن کے بارے میں یہ بات مشہور تھی کہ رسول پاک ﷺ کو ان سے خاص وابستگی تھی یا آپ ﷺ نے انہیں دنیا ہی میں جنت کی بشارت دی ہے۔ چنانچہ طلحہ اور زبیر بھی شہید کر دئے گئے۔ اور دس ہزار مسلمان جس میں بڑے بڑے جلیل القدر اصحاب رسول تھے اس جنگ میں کام آگئے لیکن جنگ کی شدت کم ہوتی نظر نہیں آرہی تھی، ام المومنین عائشہ نے بھی گویا تہیہ کر لیا تھا کہ وہ بھی خلیفہ مظلوم کے قاتلوں کے ہاتھوں جام شہادت نوش کر کے ہی دم لیں گی۔ لہذا وہ میدان جنگ میں ڈٹی رہیں اور اصحاب رسول پروانوں کی طرح انکے ہودج کے قریب اپنی جانیں قربان کرتے رہے۔ حضرت علی نے حالات کی سنگینی کا اندازہ کر لیا۔ نیز انہوں نے محسوس کیا کہ اگر ام المومنین درمیان سے علیحدہ نہ ہوئیں تو صورتحال اور ابتر ہو جائے گی۔ لہذا انہوں نے اپنے ایک سپاہی کو حکم دیا کہ جا کر ام

المومنین کے اونٹ کا اگلا داہنا قدم کاٹ دے۔ چنانچہ جب قدم کاٹ دیا گیا اور اونٹ لڑکھڑا کر بیٹھ گیا تو ہودج ایک جانب جھک کر زمین پر ٹک گیا۔ فوراً ہودج سنبھالا گیا اور علی نے پہنچ کر معذرت کے انداز میں پوچھا کہ آپ کو چوٹ تو نہیں لگی؟ پھر کہا مائی جان میں اللہ کا واسطہ دیکر آپ سے درخواست کر رہا ہوں کہ آپ میدان جنگ سے باہر چلیں یہ آپ کی جگہ نہیں۔ مجھے مسلمانوں نے خلافت کی ذمہ داری سونپی ہے لہذا مجھے اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے دیں آپ کے لئے میدان جنگ سے باہر میں نے ایک بالکل محفوظ مقام کا انتظام کر لیا ہے آپ وہیں قیام کریں۔ چنانچہ ام المومنین حضرت علی کے سمجھانے بجھانے سے میدان جنگ سے ہٹ گئیں۔ دشمنان اسلام نے انکے ہودج پر اتنے تیر برسائے تھے کہ پورا ہودج ایک بڑی سا ہی معلوم ہوتا تھا جس نے اپنے جسم کے کانٹے پھیلا لئے ہوں۔

حضرت حسن طلحہ کی لاش دیکھ کر رو پڑے اور انکے ہاتھوں کا بوسہ لے لے کر فرماتے، ابا جان! دیکھئے میں نے آپ کو روکا تھا کہ بصرہ پر لشکر کشی نہ کیجئے۔ لیجئے یہ طلحہ کی لاش ہے جنکو آنحضرت ﷺ نے جنتی اور انکے قاتل کو جہنمی قرار دیا ہے۔ حضرت علی پر بھی رقت طاری ہوگئی اور فرمایا کہ کاش کہ میں آج سے بیس برس پہلے مر چکا ہوتا اب تو جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ مقتولین کی نماز جنازہ پڑھی گئی اور انکی تدفین ہوئی۔ اور اہل بصرہ نے شکست کھا کر علی کی بیعت کر لی۔

### جنگ صفین

اس کے بعد اہل شام سے جنگ ہوئی تھی۔ حضرت علی حتی الامکان اس جنگ سے بھی بچنا چاہتے تھے۔ ایک وفد مصالحت کیلئے معاویہ کے پاس بھیج دیا، اس وفد کی قیادت سوء اتفاق سے ایک انتہائی سخت گو اور جنگ پسند فرد کے حصہ میں آئی، اسنے مصالحانہ انداز اختیار کرنے کے بجائے نہایت تیز و تند اور دھمکی آمیز لہجہ میں معاویہ سے

گفتگو کی۔ جس پر معاویہ کو سخت غصہ آیا اور کہا تو صلح کی بات کرنے نہیں بلکہ مجھے جنگ کی دھمکی دینے آیا ہے اور ہم جنگ سے ڈرنے والے نہیں۔ ہماری تلواریں قاتلین عثمان کی گردن تک پہنچ کر رہیں گی۔ اس نے واپس ہو کر علی کو معاویہ کے خلاف بھڑکایا کہ وہ آپکو قاتل عثمان سمجھتے ہیں اور آپ سے انکے خون کا انتقام لینا چاہتے ہیں۔ حضرت علی کو معاویہ کی یہ بات سخت ناپسند ہوئی۔ انہوں نے شام کی طرف فوج کشی کی۔ معاویہ کی فوج بھی آگے بڑھی۔ صفین کے مقام پر دونوں فوجوں میں گھمسان کی لڑائی شروع ہوئی۔ ابتدائی دو تین دنوں میں معاویہ کا پلہ بھاری رہا پھر اسکے بعد ان کی فوج کی پسپائی کے آثار ظاہر ہوئے۔ اس جنگ میں دونوں طرف سے نوے ہزار مسلمان مارے گئے۔ ایسا لگتا تھا کہ اسلام کا پورا قافلہ ہی اب دنیا سے رخصت ہونے والا ہے۔

معاویہ کی طرف سے نیزوں پر قرآن اٹھا کر آواز دی گئی کہ اللہ کی آخری کتاب قرآن ہمارے درمیان موجود ہے اسے حکم مان کر مسلمان آپس میں صلح کر لیں اور قتال سے باز جائیں۔ علی نے کہا بھائیو! یہ معاویہ کی چال ہے۔ اب جنگ روکنے سے کیا حاصل۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔ تھوڑی دیر میں میدان جنگ میں فیصلہ ہونے والا ہے لہذا دھوکہ نہ کھاؤ۔ اور جنگ جاری رکھو۔ سبائیوں نے سوچا کہ اگر میدان جنگ میں فیصلہ ہو گیا تو وہ معاویہ کی شکست اور علی کی فتح کا فیصلہ ہوگا۔ اہل بصرہ کی طرح اہل شام بھی شکست کھا کر علی کے جھنڈے تلے جمع ہو جائیں گے اور پھر علی مسلمانوں کو اپنے جھنڈے تلے منظم و متحد کر کے تخریبی عناصر کی سرکوبی کی طرف متوجہ ہوں گے۔ اور اب اتنی بڑی دو خونریز جنگوں کے بعد سبائیوں کی سرکوبی میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا جائیگا۔ لہذا عراق والوں نے حضرت علی کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ انہوں نے کہا اے علی! قرآن کی دعوت کو رد نہیں کیا جاسکتا، اگر تم نے فوراً جنگ بندی قبول نہ کی تو ہم تمہاری مشکلیں کسکر نیزے کی نوک پر معاویہ

کی طرف دھکیل دیں گے یا پھر تم کو اسی طرح قتل کر دیں گے جیسے ہم نے عثمان کو قتل کیا ہے، حضرت علی نے مالک اشتر کے پاس اپنا قاصد بھیجا کہ جنگ روک دے۔ لیکن اس نے قاصد کی پرواہ نہ کرتے ہوئے فوج کو لاکارا اور قاصد سے کہا کہ یہ وہ وقت نہیں ہے جس میں جنگ روکی جائے فیصلہ ہونے ہی والا ہے۔ بلوایوں نے مالک اشتر کی لاکار سن کر پھر علی پر اپنی برہمی کا اظہار کیا اور کہا کہ ایسا لگتا ہے کہ آپ نے ہماری فرمائش پر قاصد کو بھیجا دیا لیکن مالک اشتر کو درپردہ ہدایت کردی کہ وہ جنگ کو جاری رکھے۔ دیکھئے اگر جنگ فوراً بند نہیں ہوتی ہے تو ہم آپ کو پکڑ کر معاویہ کے حوالے کر دیں گے یا بری طرح قتل کر دیں گے۔ حضرت علی نے قاصد کو دوبارہ ڈانٹ کر کہا کہ جاؤ مالک اشتر کو کہو فوراً جنگ بند کر دے اور واپس آجائے کیونکہ اب فتنہ خود ہمارے گھر میں برپا ہو چکا ہے۔ جنگ اپنے انجام کو پہنچ کر بھی بے نتیجہ رہی۔ اور وہ دشوار و پیچیدہ صورتحال جو جنگ سے قبل تھی ایک لاکھ مسلمانوں کے قتل کے بعد بھی جوں کی توں قائم و باقی رہی۔

حضرت علی بالکل دل برداشتہ ہو چکے تھے، بلکہ ان دشمنان اسلام کی ناپاک سازشوں کی وجہ سے ان کی کمرہمت توڑ چکی تھی۔ کبھی حسرت سے وہ معاویہ کی قلیل، لیکن وفادار فوج کا تذکرہ کرتے اور ساتھ ہی اپنے بے وفاسبائی مباہعین پر کف افسوس ملتے اور فرماتے کہ اگر معاویہ جیسی وفادار فوج مجھے میسر آتی تو میں بہت ہی قلیل تعداد کے ساتھ غالب آجاتا اور کبھی اس بات کی تمنا کرتے کہ کب میری زندگی میں وہ مبارک دن آئے گا کہ مجھے خلافت کے اس ناقابل برداشت بوجھ سے نجات میسر ہوگی کیونکہ اس نازک اور پر آشوب دور میں وہ بار خلافت اٹھانے ہی پر رضامند نہ ہو رہے تھے اور لوگوں کے زور دینے سے ہوئے بھی تو فتنہ سبائیت نے انہیں بالکل مجبور کر دیا۔ محصور اور بے دست و پا کر کے رکھ دیا اور پانچ سالہ دور خلافت میں اسلامی فتوحات تو دور کی بات تھی داخلی

انتشار اور خانہ جنگی ہی سے فرصت نہ مل سکی۔ صلح کی تمام کوششیں ایک ایک کر کے ناکام بنائی گئیں اور ان کے نہ چاہنے کے باوجود ہر موقع پر جنگ کی آگ بھڑکائی گئی اور بے دریغ مسلمانوں کا خون بہایا گیا جب جنگ نہ چاہی تو جنگ پر مجبور کئے گئے اور جنگ کی صعوبت جھیل کر جیتنے کی حیثیت میں ہوئے تو جنگ بندی پر مجبور کر دئے گئے۔

اور ایسا لگتا تھا کہ طلحہ وزیر اور عائشہ صدیقہ کے چشم دید بیان واقعات سے اہل کوفہ و بصرہ و اہل شام سبائیوں کے بیعت کی اس حقیقت کو پہلے ہی اچھی طرح سمجھ چکے تھے اور جان چکے تھے کہ عثمان کے بعد علی بھی سبائیوں کے زرعے میں آچکے ہیں اور جلد یا بدیر ان کا بھی وہی انجام ہونے والا ہے جو خلیفہ سوم کا ہوا، انکا یہ اندیشہ اپنی جگہ بالکل درست ثابت ہوا۔ سبائیہ مسلمان نہ تھے بلکہ یہ یہود کی سازشی ایجنسی تھی جس کا کام ہی اسلام کے نظام خلافت کو درہم برہم کرنا اور ایک کو دوسرے سے ٹکرانا تھا وہ نہ اہل بیت نہ بنو ہاشم کے دوست تھے اور نہ بنو امیہ کے۔ دونوں ہی کے غلبہ اور سرداری کو یہود و نصاریٰ کے لئے مستقل خطرہ سمجھتے تھے۔ حضرت عمر کے دور خلافت میں یہود و نصاریٰ کو انتہائی ذلت آمیز شکست سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ اور ایسا نظر آ رہا تھا کہ دوسرا کوئی اور فاروق پیدا ہو گیا تو پوری دنیا سے کفر و باطل کا نام و نشان مٹ جائے گا۔ لہذا قوم یہود کو جسکی اسلام دشمنی تمام کافر و مشرک اقوام سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ اپنی بقا صرف نظام اسلام کو درہم برہم کرنے اور خلفاء اور امراء کو ایک ایک کر کے قتل کرنے اور اہل اسلام کے مابین طبقاتی نفرت و عداوت پھیلانے ہی میں نظر آئی اور انہوں نے خلافت عثمان کی ابتداء ہی سے اپنی منظم سازشوں کا جال پھیلانا شروع کر دیا۔ سیدنا ابوبکر جنکی مدت خلافت صرف دو سال پانچ ماہ تھی انہیں کو اپنے بسترِ طبعی موت نصیب ہو سکی انکے بعد عمر، عثمان، علی و حسن و حسین اور انکے ساتھ پورا خاندان نبوت چن چن کر قتل کر دیا گیا۔ قاتل گو بظاہر مسلمان تھے مگر ہرگز مسلمان نہ

تھے۔ مسلمان، مسلمان کا عمداً قاتل نہیں ہو سکتا اور ان تمام خلفاء و امراء اور ائمہ کا قاتل تاریخ کے گہرے اور غیر جانبدارانہ مطالعہ کی روشنی میں ایک ہی سلسلہ کی مختلف کڑیاں نظر آتا ہے۔ گو تاریخی اخبار و آثار کی بھی ایک حیثیت ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے لیکن ان اخبار کا درجہ ایک مومن و مسلم کی نظر میں ان اخبار و آثار کے بعد ہے جو قرآن و سنت میں موجود ہے۔ مثلاً اگر قرآن پاک ہمیں یہ خبر دیتا ہے کہ محمد رسول اللہ اور وہ لوگ جو بحالت ایمان ان کے ساتھی بنے وہ کافروں پر سخت اور آپس میں رحمدل ہیں اور یہ کہ اللہ ان سب سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے اور یہ کہ اللہ انھیں اپنی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں رواں ہوں گی۔ وغیرہ ذالک تو کیا ممکن ہے کہ قرآن مجید میں دی ہوئی یہ خبریں آئندہ چلکر غلط ثابت ہوں اور جن کی سرشت اور فطرت قرآن نے یہ بیان فرمائی ہو کہ کافروں پر سخت اور اہل ایمان پر انتہائی نرم ہیں وہی قوم آئندہ چند سالوں کے بعد آپس میں ایک دوسرے کے خون کی پیاسی اور دشمن بن جائے اور جن کیلئے اللہ نے اپنی رضا اور جنت کی بشارت اسی دنیا میں دیدی انکا انجام اسکی رضا کے بجائے اسکی ناراضی و بے زاری اور جنت کے بجائے جہنم ٹہرے۔ ایسی صورت میں تو نعوذ باللہ علم الہی ہی غلط ہو جائے گا۔ لیکن سبائی لعینوں کو قرآن کریم اور اسکی خبروں سے کیا واسطہ، وہ تو اسلام و اخلاق و دین ہر چیز کے دشمن تھے انھوں نے ایک طرف تو موضوع و من گھڑت روایات شیعان علی میں پھیلائیں تو دوسری طرف انکی کتب عقائد میں مسئلہ ”بدا“ داخل کر دیا۔ تاکہ اہل ایمان صحابہ کے متعلق قرآنی اخبارات سے مسلمانوں کی توجہ کو پھیرا جاسکے۔

”بدا“ کے معنی ظہر کے ہیں یعنی (ظہر فی علم اللہ مالم یکن فی علمہ قبل) ”اللہ کے علم میں وہ بات آئی جو حادثہ کے ظہور سے قبل نہ تھی“ لہذا صحابہ اور قرآن کی



حفاظت کے متعلق جو کچھ اسنے قبل از وقت خبر دی تھی کہ صحابہ مہاجرین و انصار سب کے سب اللہ کی رضا اور جنت کے سزاوار ہوئے اور یہ کہ قرآن کریم کی ہم ہمیشہ حفاظت کریں گے۔ نیز یہ کہ اس میں باطل کی آزمائش نہیں ہو سکتی اور یہ رب عزیز و حمید کی تزیل ہے یہ ساری باتیں آئندہ حالات و واقعات کی روشنی میں گویا نعوذ باللہ غلط اور بے بنیاد ثابت ہوئیں۔ اسلئے کہ سہائیت کے عقیدہ کے مطابق اللہ تعالیٰ آئندہ پیش آنے والے واقعات و حوادث کو انکے پیش آنے سے قبل نہیں جانتا۔ اسی کو مسئلہ ”بدأ“ کہتے ہیں۔ جو شیعہ کتب عقائد میں اسی طرح موجود ہے۔ چنانچہ سہائیت زدہ شیعیت موجودہ تیس پاروں والے قرآن کو بھی قرآن منزل نہیں بلکہ بیاض عثمانی قرار دیتی ہے۔ کتب شیعہ میں سہائیوں نے یہ روایت بھی درج کر دی ہے کہ وہ قرآن جو محمد رسول اللہ پر نازل ہوا چالیس پاروں پر مشتمل تھا۔ اللہ کے دشمنوں ابو بکر و عمر و عثمان نے اسمیں دس پارے حذف کر دئے جو علی کی فضیلت میں تھے۔ اصل قرآن کا ایک نسخہ اہل بیت کے یہاں محفوظ تھا جسکو حضرت امام حسن عسکری جو آئندہ مہدی زماں بنکر ظاہر ہوں گے لے کر غار ”سمر من رأی“ یا سامرہ میں روپوش ہو گئے۔ وہ قرآن لے کر اس وقت ظاہر ہوں گے جب ۳۱۳ شیعہ ایماندار دنیا میں موجود ہوں گے گویا اب تک دنیا میں اتنی تعداد میں ایماندار شیعہ بچے وجود پذیر نہ ہو سکے۔ دراصل یہ اور ایسی واہی روایات شیعیت پر بھی ایک ضرب کاری ہے۔ اگر موجودہ قرآن کو منزل قرآن تسلیم کریں تو تمام صحابہ کرام اور کاتب وحی معاویہ کو ”رضی اللہ عنہ“ کہنا پڑیگا اور پھر تبراً و توتلی کا دروازہ ہمیشہ کیلئے بند ہو جائیگا اور پھر سہائیت کو اپنی شیطنت کی پردہ پوشی کا موقع نہ مل سکے گا۔

عقدِ تحکیم

جنگ کے اختتام کے بعد معاویہ اور علی کے مابین معاہدہ تحکیم عمل میں آیا اس

تاریخی دستاویز صلح پر فریقین نے دستخط کر دئے اور اسمیں فریقین اور انکے ساتھیوں کو مومنین و مسلمین تسلیم کیا گیا۔ جیسا کہ دوران جنگ فریقین ایک دوسرے کو مومن و مسلم تسلیم کرتے تھے۔ معاویہ کی جانب سے صلح کی بات چیت کرنے کیلئے عمرو بن العاص کو نمائندہ نامزد کیا گیا علی چاہتے تھے کہ ان کی جانب سے عبداللہ بن عباس کو نمائندہ مقرر کیا جائے لیکن سبائی جو ہر سنجیدہ کام بگاڑنے پر تلے ہوئے تھے اس بات پر مصر تھے کہ ان کی جانب سے نمائندہ ابوموسیٰ اشعری کو مقرر کیا جائے۔ علی نے فرمایا بھائیو! ابوموسیٰ اشعری تو مجھے اس جنگ میں حق بجانب ہی نہیں تسلیم کرتے ہیں وہ تو اس جنگ کو فتنہ عمیاء و صماء اندھا و بہر اذنتہ قرار دیتے ہیں تو وہ میری نمائندگی کا حق کیسے ادا کریں گے۔ علی نے کہا بھائیو! میں تمہارا امیر تھا اور تم نے اب تک کوئی بات میری نہیں مانی۔ اب یہ آخری بات مان لو کہ ہماری نمائندگی کا حق ابوموسیٰ اشعری ادا نہیں کر سکتے لہذا ابن عباس کو نمائندہ نامزد کرو انہوں نے کہا ہرگز نہیں ہماری نمائندگی ابوموسیٰ اشعری ہی کریں گے۔ علی خاموش ہو گئے اور ابوموسیٰ کو علی کا نمائندہ نامزد کیا گیا ابوموسیٰ نے اپنے طور پر علی کو معزول کر دیا اور چاہا کہ عمرو بن العاص معاویہ کو معزول کر کے از سر نو خلیفہ کے انتخاب کی شکل پیدا کریں، لیکن عمرو بن العاص نے کہا کہ آپ نے اپنے طور پر علی کو معزول کر کے اختلاف کو ختم کر دیا ہے۔ خلیفہ سوم کا مظلومانہ قتل اور انکا قصاص نہ لیا جانا دونوں فریق کے مابین وجہ نزاع تھا۔ بنو ہاشم میں علی سے بڑھکر دوسرا کون ذی اثر شخص ملے گا جو خون عثمان کا قصاص معاویہ کو دلوا سکے، لیکن جب علی نہ کر سکے تو دوسرا کون کر سکے گا۔ اب دوسرے فریق معاویہ ہیں جو عثمان کے ولی اقرب ہیں وہ قصاص لینا چاہیں تو قصاص لیں، معاف کرنا چاہیں تو معاف بھی کر سکتے ہیں انہیں شرعاً دونوں باتوں کا اختیار ہے، اختلاف کے ایک فریق کو آپ نے معزول کر دیا اب دوسرا فریق ہے جسے قصاص لینے یا معاف کر دینے کا حق حاصل ہے۔ لہذا معاملہ اسی کے سپرد کر دینا

زیادہ قرین مصلحت ہوگا بہ نسبت اسکے کہ اسے بھی معزول کر کے کیسی تیسرے کا انتخاب کیا جائے پھر وہ تیسرا بھی تو قریش کے انھیں دونوں بڑے خاندانوں میں سے کسی ایک خاندان کا فرد ہوگا۔ بنو امیہ میں معاویہ سے بہتر اور بنو ہاشم میں علی سے بہتر شخص کہاں سے تلاش کیا جاسکے گا؟ لہذا آپ نے تو علی کو معزول کر دیا اور میں معاویہ کو باقی رکھتا ہوں۔ ابو موسیٰ اشعری بہت جربز ہوئے اور اپنی عجلت پسندی پر شرمندہ و نادم بھی ہوئے۔ عقد تحکیم میں بازی ہار کر گھر بیٹھ رہے اور شرمندگی سے ایک مدّت تک علی سے ملاقات نہ کی۔ علی اور شیعان علی تو معاملہ کو ایک رخ پر ہوتے ہوئے دیکھ کر خاموش رہے لیکن بد بخت سبائیہ نے دوبارہ مسلمانوں کے درمیان شورش و اختلاف برپا کرنے کے لئے معاویہ و عمرو بن العاص اور علی بنیوں کے خلاف شور و ہنگامہ برپا کیا۔ معاویہ اور عمرو بن العاص پر بد عہدی کا الزام عائد کیا اور علی کو انکے ساتھ صلح کرنے کے الزام میں کافر قرار دیا۔

### ظہور خوارج

حضرت علی کے نام نہاد حامیوں میں سے ایک جماعت نے کھل کر انکے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا انکا نعرہ تھا: ﴿إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ﴾ (الأنعام: 57) ”حکم اور فیصلہ تو بس اللہ کا ہے“۔ ان کے نزدیک اللہ کا فیصلہ جو اسکی کتاب میں موجود ہے یہ تھا ﴿وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا فَإِنْ بَغَت إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَى فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّى تَفِيءَ إِلَى أَمْرِ اللَّهِ فَإِنْ فَاءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ﴾ (الحجرات: ۹)

”اگر مومنوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو انکے درمیان مصلحت کرادو اور اگر ایک گروہ دوسرے پر بغاوت کرے تو باغی گروہ سے اس اسوقت تک قتال جاری رکھو

تا وقتیکہ وہ اللہ کے حکم کی طرف رجوع کرے۔ یعنی ترک بغاوت کر کے سماع و طاعت کا راستہ اختیار کرے۔“

یہ لوگ معاویہ اور ان کے ساتھی گروہ کو اور اسی طرح عائشہ اور طلحہ و زبیر کے گروہ کو باغی قرار دیتے تھے حالانکہ ان میں سے کوئی ایک بھی اصلاً علی کی بیعت خلافت کا منکر نہ تھا، اور رہی قصاصِ عثمان کے مطالبہ کی شرط، تو وہ خلیفہ سوم کے باغیوں (سبائیوں) سے تحفظ کے لئے تھی اور قرآن پاک کے دئے ہوئے حق کے عین مطابق تھی ﴿وَمَنْ قَتَلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لَوْلِيَّهِ سُلْطٰنًا﴾ (الإسراء: 33) ”جو شخص مظلوماً قتل کیا جائے تو ہم نے اس کے ولی کے لئے قاتل پر غلبہ کا حق رکھا ہے۔“

مصالحت کی گفتگو میں عمرو بن العاص نے باقاعدہ یہی آیت ابو موسیٰ اشعری کے سامنے پیش کی تھی۔ اور اللہ تعالیٰ کی کتاب کے حکم مننے کا تقاضا یہی تھا کہ جو مسلمان بیعت سے علیحدہ تھے وہ بیعت کرتے اور جسے قاتل پر اللہ نے غلبہ کا حق دیا تھا اس کا مطالبہ قصاص پورا کیا جاتا۔ پھر اصحابِ جمل تو قصاص سے پہلے ہی بیعت کے لئے علی کے ساتھ بات چیت پر رضامند ہو گئے تھے۔ اور علی نے معاویہ سے قبل بیعت چار ماہ کی مدت میں قاتلین سے قصاص دلوانے کا وعدہ بھی کر لیا تھا۔ اور اس مدت کے دوران حالات بالکل پرسکون تھے۔ لیکن دونوں جگہ صلح و مصالحت اور انعقاد بیت کی راہ میں سبائیوں نے ہی روڑے اٹکائے۔ لہذا حضرت علی اور ان کے حامیوں (شیعیان علی) کے خلاف خوارج کا الزام بالکل بے بنیاد تھا کہ انھوں نے قرآن کے بالکل واضح اور متعین حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اس کے خلاف عقدِ تکہیم کو قبول کیا ہے۔ یہ کس طرح ممکن تھا کہ جمل اور صفین میں طرفین سے ایک لاکھ مسلمانوں کے قتل کے بعد قرآنی حکم کے برخلاف علی کس طرح ثالثی قبول کریں۔ یا وہ اور ان کے ساتھی صحابہ و اہل بیت کسی ناحق بات پر خاموش رہیں بلکہ الٹے

رضا مند ہو جائیں۔ اگر ابو موسیٰ اور عمرو بن العاص کی گفتگو میں ایسی کوئی دھاندلی واقع ہوئی ہوتی تو فوراً دوبارہ جنگ بھڑک اٹھتی اور جنگ کے اختتام کے وقت چونکہ غلبہ علی کی فوج کو حاصل تھا۔ لہذا جنگ میں بھی انھیں کامیابی متوقع تھی، لیکن کمزور فریق کی جانب سے مصالحت کی بات چیت میں کھلی دھاندلی اور طاقتور فریق کی جانب سے صبر اور خاموشی بالکل ناقابل فہم بات ہے۔ دراصل تاریخ نویس یا تاریخ کا مطالعہ کرنے والا اگر پہلے سے ہی صحابہ کو اہل بیت کا دشمن مان لے اور ان کو قرآنی تصریحات ﴿رَحَمَاءٌ بَيْنَهُمْ﴾ (الفتح: ۲۹) ”آپس میں ایک دوسرے پر نہایت مہربان“ ﴿أَذَلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ﴾ (المائدة: 54) ”ایل ایمان کے مقابل خود کو ہیچ سمجھنے والے“ ﴿رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُمْ﴾ (المائدة: ۱۱۹) ’اللہ ان سے راضی ہو اور وہ اللہ سے راضی ہوئے‘ کے مطابق بالکل پکا سچا اور کامل مومن و مسلم تسلیم نہ کرے تو تاریخی واقعات کو بھی وہ گھما پھرا کر غلط معانی نکالنے کی کوشش کریگا۔ صحابہ و اہلبیت سے باہر تابعین میں سے ایک بہت بڑا منظم گروہ سبائیوں کا تھا۔ انھیں میں سے بعد کو خوارج نمودار ہوئے جنھوں نے علی کے خلاف منظم بغاوت کی اور انھیں اور ان کے ساتھیوں کو علانیہ کافر و مرتد قرار دیا۔ انھوں نے علی کی بیعت کو توڑ کر اپنی جماعت سے اپنا امیر بھی چن لیا اور انھیں کے تین اشخاص نے بیک وقت عمرو بن العاص، معاویہ و علی کو قتل کر دینے کا منصوبہ تیار کیا۔ علی کو عبد الرحمن بن ملجم نے تلوار کے دو ضربات سے سخت زخمی کر دیا جس کے نتیجے میں وہ شہید ہو گئے۔ اور معاویہ شدید زخمی ہو کر بال بال بچ گئے۔ عمرو بن عاص اتفاق سے اس دن بیمار تھے اور صبح نماز فجر کے لئے مسجد نہ جاسکے۔ وہ اس طرح قتل یا زخمی ہونے سے بچے۔ خلفائے راشدین میں سے تین خلیفہ پے درپے دشمنان اسلام یہود و نصاریٰ اور مجوس کی سازش کا شکار بنے۔ صرف ابو بکر کو جن کی مدت خلافت صرف دو سال پانچ ماہ کی مختصر مدت تھی انھیں کو اپنے بستر پر طبعی

موت نصیب ہوئی۔

علی اور معاویہ و عمرو بن عاص کے باہم نزاع و اختلاف کے باوجود ایک ہی گروہ کے تین اشخاص نے بیک وقت تینوں قوتل کرنے کا منصوبہ بنایا اور ان اشخاص کا تعلق علی کے گروہ سے تھا، یعنی خوارج سے۔

ظہور و انفض

علی کے خلاف خوارج کی بغاوت کے دوران شیعان علی کے نام سے ایک غالی فرقہ نمودار ہوا جو روانفض کہلائے۔ ابتداءً شیعان علی تو وہ تھے جو جمل و صفین کی جنگ میں علی کے موقف کے حامی تھے اور جنہوں نے علی کے ساتھ معاویہ اور ان کے حامیوں کو عقد تحکیم کے وقت مومنین و مسلمین تسلیم کیا تھا اور وہ صحابہ اور اہل بیت تھے، لیکن خوارج نے جب علی اور شیعان علی پر حکم کفر لگایا اور ان سے قتال کا راستہ اختیار کیا تو روانفض نے علی کو رب مان کر مختار کل ہونے کا اعلان کر دیا اور صحابہ و اہل بیت سے الگ کر دیا تھا اور تعلقات ترک کر دئے تھے۔ دراصل یہ سبائی تھے جو تقیہ کر کے خود کو شیعان علی ظاہر کرتے تھے۔ حضرت علی نے اس فرقہ کے لوگوں کو ظلم عظیم (شرک) سے باز رکھنے کے لئے آگ کی خندقوں میں ڈھکیل کر زندہ جلا ڈالنے کا حکم دیا تھا۔ لوگوں نے علی کو ایسا کرنے سے روکا کہ آپ انہیں ایسی سزا نہ دیں جو اللہ نے اپنے لئے مخصوص کی تھی تو علی نے فرمایا: ”کہ اگر یہ لوگ مجھے رب کا شریک ٹھہرائیں گے تو اللہ میرے ہاتھوں سے انہیں ایسی ہی سزا دلوائے گا جو اس نے اپنے لئے مخصوص کی ہے۔“

یہ خلافت علی کے دور کا ایک آخری فتنہ تھا کہ انھیں اپنے نام نہاد حامیوں کے ساتھ ایسا سلوک بھی کرنا پڑا۔ وہ حامی نہ تھے بلکہ حمایت کے نام پر علی کو مسلمانوں میں بدنام کرنے کے درپے تھے۔ گویا یہ سبائی شیطنیت کی انتہا تھی۔

## معاویہ کی خلافت کا استحکام

عقدِ تحکیم میں علی کے معزول کئے جانے کے بعد عرب کے تمام صوبے ایک ایک کر کے معاویہ کو اپنا خلیفہ تسلیم کر چکے تھے۔ صرف ایک صوبہ عراق باقی تھا جو اس پورے دورِ نزاع میں فتنوں کا سب سے بڑا مرکز بنا۔ جس طرح عثمان اور معاویہ کے حامیوں کا مرکز صوبہ شام تھا۔ اسی طرح علی کے حامیوں کا سب سے بڑا مرکز عراق تھا۔ لیکن اہل شام نے جس طرح ہر موقع پر معاویہ اور ان کے خاندان کے ساتھ وفا کی، اہل عراق نے علی و اہل بیت کے ساتھ قدم قدم پر غداری اور دغا کی۔

## حسن بن علی کی خلافت

اب جبکہ تمام صوبے ایک ایک کر کے معاویہ کی بیعت قبول کر چکے تھے تو اس بات کا سوال ہی نہ تھا کہ حضرت امام حسن اہل کوفہ کے امیر بننے پر رضامند ہوتے، لیکن اہل عراق بنو امیہ کے کسی ایک فرد کو بھی اپنا خلیفہ و امام ماننے پر تیار نہ تھے۔ چنانچہ وہ اس بات پر بضد تھے کہ معاویہ کو اپنا امیر تسلیم نہ کر کے حسن بن علی کو اپنا امام و امیر بنائیں گے۔ چنانچہ حضرت امام حسن نے اپنی خلافت کیلئے نہیں بلکہ مسلمانوں کو کسی اور متوقع فتنہ سے بچانے کے لئے محض مصلحتاً ان کی یہ پیش کش قبول کر لی اور ان سے سب و طاعت کی بیعت لے لی۔

اب معاویہ اس بات کو کیسے برداشت کر سکتے تھے کہ جب تمام صوبے ان کی طاعت قبول کر چکے تو اہل عراق اپنا امیر کسی اور کو چن لیں۔ لہذا انہوں نے اہل عراق کی طرف پیش قدمی کی تو اہل عراق نے بھی کمر ہمت باندھی کہ وہ امام حسن کی خلافت کیلئے معاویہ سے لوہا لینے کیلئے تیار ہیں۔

چنانچہ اہل عراق کی خواہش اور تقاضے کے مطابق امام حسن عراقی مجاہدوں کی فوج

لے کر مقابلہ کیلئے روانہ ہوئے۔ راستے میں رات کے وقت ایک مقام پر قیام فرمایا: تو آپ نے اپنے چند مخصوص لوگوں کو متعین کر دیا کہ لوگوں کے خیمے کے قریب ہو جائیں، اور کان لگا کر ان کی سرگوشیاں سنیں، کیوں کہ دھوکہ دہی کی ایسی سازشیں کرنے کیلئے اہل عراق اب کافی حد تک بدنام ہو چکے تھے۔ صبح حضرت حسن کو خبر دی گئی کہ اکثر لوگ اپنے خیموں میں آپ کی اس پیش قدمی کا ہنس ہنس کر مذاق اڑا رہے تھے کہ جب تمام صوبے عرب کے علی کے ساتھ تھے اور صرف ایک صوبہ معاویہ کے پاس تھا تو علی کی ان سے پیش نہ گئی اور صفین کی جنگ ہار بیٹھے اور آج جبکہ عراق کے علاوہ تمام صوبے معاویہ کی امارت کو تسلیم کر چکے ہیں تو علی کے صاحبزادے اہل عراق کو لے کر آج معاویہ کا مقابلہ کرنے جا رہے ہیں۔

امام حسن کی معاویہ سے صلح

حضرت امام حسن نے جب عراقی مفسرین کی یہ باتیں سنی تو اسی مقام سے ایک خط معاویہ کو لکھ دیا کہ ہم آپ سے جنگ نہیں، صلح کرنا چاہتے ہیں۔ حسن کی معاویہ کے ساتھ اس صلح کی پیش کش کا مطلب اسکے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ وہ خود کو اور اپنے مباہعین کو معاویہ کی بیعت میں داخل کرنا چاہتے تھے۔ اور اب اسکے جواب میں معاویہ کی طرف سے اتنا ہی تحریر کر دینا کافی تھا کہ ہم آپ کے ممنون اور شکر گزار ہیں کہ آپ نے مسلمانوں کو باہم جدال و قتال سے بچالیا۔

لیکن معاویہ نے امام حسن کو اسکے جواب میں لکھا: اے نواسہ رسول! ہمیں کوئی شبہ نہیں کہ آپ مجھ سے علم و فضل، دین و دیانت اور ورع و تقویٰ میں فائق و برتر ہیں لہذا اگر آپ مجھے باور کرا سکیں کہ اس درجہ اختلاف و انتشار کے دور میں آپ اپنی سیاسی حکمت عملی سے مسلمانوں کو اپنے جھنڈے تلے جمع کر لیں گے تو سب سے پہلے میں خود آپ کی بیعت کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن اگر آپ کو میری سیاسی بصیرت پر اعتماد ہے تو یہ کام آپ مجھ



پر چھوڑ دیں اور جو بھی شرائط آپ مجھ سے منظور کرانا چاہیں وہ اس منسلکہ سادہ کاغذ پر جس پر میرے دستخط مہرِ خلافت کے ساتھ ثبت ہیں لکھ بھیجیں وہ مجھے پیشگی منظور ہیں۔

امام حسن معاویہ کے اس خط سے بے حد متاثر ہوئے اور اس فیاضانہ پیش کش کو معاویہ کے خلوص اور نیک نیتی پر محمول کیا اور پھر چار شرطوں کے ساتھ معاویہ سے صلح کر لی اور ان کے حق میں خلافت سے دستبردار ہو گئے۔ وہ چار شرطیں حسب ذیل تھیں:

۱۔ اہل عراق کو عام معافی دیدی جائے اور ان سے اب کسی قسم کا انتقام نہ لیا جائے

۲۔ ابوہز کے علاقہ کا خراج مجھے اپنے اخراجات کے لئے دیدیا جائے

۳۔ حضرت امام حسین کو ۱۲ لاکھ درہم ان کے سالانہ اخراجات کیلئے دیا جائے

۴۔ صلوات و عطیات میں حسب دستور سابق بنو ہاشم کا لحاظ رکھا جائے

معاویہ نے من و عن ان چاروں شرطوں کو منظور کر لیا اور امام حسن نے

امیر معاویہ کی اطاعت قبول کر لی۔

حضرت حسن پر اہل کوفہ کی برہمی

جب اہل کوفہ کو یہ علم ہوا کہ حضرت حسن نے معاویہ کی اطاعت قبول کر لی ہے

تو انھوں نے ان پر سب و شتم کیا۔ منہ پر تھوکا اور گریبان چاک کر دیا۔ اور نذل المؤمنین

عار المؤمنین اور مسوٰ دو جوہ المؤمنین جیسے بدترین خطابات سے نوازا۔

حضرت امام حسن نے فرمایا: (طاعتکم طاعة معروفة) ”تمہاری اطاعت

شعاری کا حال مجھے اچھی طرح معلوم ہے“۔ لہذا میں نے تمہارے لئے وہی راستہ اختیار کیا

ہے جس میں تمہاری مصلحت اور بہتری دیکھی۔ بس اب جا کر تم بھی معاویہ کی اطاعت قبول

کر لو اور زیادہ شیخیاں مت مارو۔

شہادت حسن

جب اہل کوفہ کے ناپاک عزائم کو حسن نے اس طرح ناکام بنا دیا تو انکے پاس آپ سے انتقام لینے کا کھلا ہوا راستہ باقی نہ رہا۔ اگر وہ اس واقعہ کے بعد امام حسن کو اسی طرح قتل کرتے جس طرح امام حسین کو کربلا میں شہید کیا تو معاویہ کے غیظ و غضب کا نشانہ بنتے اور پھر معاویہ کیلئے بھی ان سے کھل کر انتقام لینے اور انکو انکی شرارتوں کی پوری سزا دینے کا جواز فراہم ہو جاتا۔ لہذا انہوں نے حسن کو زہر دلو کر شہید کر دیا۔ اور پھر سبائیہ نے اٹلے اسکی ذمہ داری معاویہ کے سر پر تھوپنی چاہی۔ حالانکہ یہ بات کسی طرح قابل قبول نہیں ہو سکتی کہ معاویہ جیسے دورانہدیش سیاسی انسان اپنے انتہائی مخلص و محسن کو خود زہر دلوادے۔ معاویہ نے تو امام حسین سے کوئی تعرض نہ کیا جن کے متعلق انکو مسلسل خبریں پہنچائی جاتی رہی ہیں کہ وہ درپردہ انکی بیخ کنی میں مصروف ہیں بلکہ انکے حق میں اپنے بیٹے یزید کو وصیت کی تھی کہ اہل کوفہ حسین کو تمہارے خلاف ابھارنے کی کوشش کریں گے لیکن وہ ہمارے محسن ہیں اور ہمارے رسول کے نواسے ہیں لہذا ان کے ساتھ درگزر اور رواداری کا برتاؤ کرنا۔ حضرت حسن سے معاویہ کو کون سا خطرہ تھا جبکہ وہ انکے حق میں اپنی خوشی سے خلافت سے دستبردار ہو چکے تھے۔ اور اپنے بعد یزید کیلئے جس سے خطرہ تھا وہ حسین تھے، نہ کہ حسن۔ حسن نے تو ایک بار کوفہ کے سبائیوں کا منہ کالا ہی کر دیا تھا۔ لہذا وہ دوبارہ انکی طرف کب نظر اٹھا سکتے تھے۔ دراصل پوری تاریخ سبائیت میں ایک چیز ہر جگہ نظر آئیگی۔ یعنی ایک ہی تیر سے چند شکار۔ تخریب کاری اور پھراس کا الزام بھی انہیں پر ڈالنا جن کی تخریب کی جا رہی ہے۔ معاویہ کا ایک بازو بھی کاٹ دیا اور پھر انہیں پر الزام عائد کر دیا کہ انہوں نے خود ایسا کیا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ معاویہ کی زندگی میں کسی کی مجال نہ ہوئی کہ انکی بابت ایسی کوئی بات اپنی زبان پر لاسکے۔

خاندان نبوت پر سبائیت کا آخری وار

اب امام حسن کے بعد ان کے چھوٹے بھائی امام حسین تھے۔ یزید کیلئے خلافت کی بیعت معاویہ نے اپنے ارباب شوریٰ کے مشورے سے لے لی تھی۔ شورا بیت عامہ کا خاتمہ تو علی کی خلافت ہی سے ہو چکا تھا، اب تو گروہی سیاست کا دور تھا۔ لہذا جو لوگ معاویہ پر معترض ہوتے ہیں کہ انہیں ایسا کرنے کا ہرگز حق نہیں تھا وہ اس وقت کے حالات کی نزاکت پر نظر نہیں رکھتے۔ وہ ابو بکر و عمر کے دور پر نگاہ رکھتے ہیں جس وقت مسئلہ خلافت کی بابت مسلمانوں میں کوئی ادنیٰ کشمکش بھی نہ تھی۔ شیخین نے رسول کی نیابت کا حق جس طرح ادا کیا اسے دیکھ کر ہر کس و ناکس خلافت کی تمنا بھی نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن قتل عثمان کے بعد قریش کے دونوں بڑے خاندانوں (بنو ہاشم و بنو امیہ) میں وہ پہلے جیسی بات نہ رہی کہ بلا اختلاف و کشمکش ایک خاندان دوسرے خاندان کی سرداری قبول کر لے۔ خود حضرت علی نے دونوں جنگوں کے مصائب گوارا کر لئے لیکن شورا بیت عامہ کی بابت کوئی بات نہ سوچ سکے۔ لہذا جب جمل و صفین سے پہلے اسکا امکان ختم ہو چکا تھا تو اسکے بعد کیسے ہو سکتا تھا۔ لہذا معاویہ کو اپنے دور میں ایسا کوئی اقدام کرنے کیلئے اپنی ہی شوریٰ سے مشورہ کرنا تھا۔ تاریخی واقعات شاہد ہیں کہ معاویہ کو ایسا کرنے میں کسی قسم کی کوئی خاص دشواری اور مخالفت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ صرف قابل ذکر حضرات میں سے چار ہستیوں نے یزید کی بیعت نہیں کی تھی۔ پھر ان میں سے بھی دو نے یعنی عمر و ابن عباس نے بیعت کر لی۔ اب صرف امام حسین اور عبداللہ ابن زبیر تھے، تاہم دونوں میں فرق تھا۔ عبداللہ ابن زبیر تو مکہ میں کھل کر حجاج کے مقابلے پر ڈٹ گئے اور جان دیدی۔ لیکن امام حسین نے خود اپنی جانب سے کوئی مخالفانہ رویہ اختیار نہیں کیا تھا۔ اہل کوفہ انہیں طرح طرح سے اکساتے رہے۔ خطوط پر خطوط اور وفود پر وفود ان کی خدمت میں بھیجتے رہے۔ پے در پے خطوط کے دو تھیلے حضرت حسین کے پاس پہنچا دیئے گئے لیکن امام حسین کو پھر بھی ان غداروں پر یقین نہ آیا تو صورت حال کے

مشاہدہ کیلئے اپنے چچیرے بھائی مسلم بن عقیل کو بھیجا۔ انکے ہاتھ پر اٹھارہ ہزار افراد نے حسین کی بیعت کر لی، اور بعض روایات کے مطابق تیس ہزار افراد نے حسین کی بیعت کر لی جس پر انھوں نے خود حضرت حسین کو کوفہ آنے کی دعوت دی۔

اب جبکہ مکہ سے حسین بن علی کوفہ کی طرف روانہ ہوئے تو قدم قدم پر آپ کے رفقاء نے کوفہ جانے سے آپ کو روکنا چاہا اور کہا کہ اہل کوفہ غدار ہیں۔ آپ کے والد اور بڑے بھائی سے غداری کر چکے ہیں وہ آپ کے ساتھ وفانہ کریں گے۔ اور آپ کے سامنے ہمیں ہلاکت ہی نظر آرہی ہے۔ مگر حضرت مسلم کے خط کے بعد آپ نے کسی کے مشورہ کی پرواہ نہ کی اور آگے ہی بڑھتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ مقام کربلا پر پہنچ کر آپ کے ساتھیوں کو بے دردی سے شہید کر دیا گیا۔ کوفہ کو علی نے اپنا دارالخلافہ بنایا تھا اور وہاں انکے ماننے والوں کی اکثریت تھی، جس طرح معاویہ اور یزید نے شام کو اپنا دارالخلافہ بنایا، جہاں انکے حامیوں کی اکثریت تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ اہل شام وفا شعار تھے اور انہوں نے اپنے امام سے کبھی غد نہیں کیا۔ اور اہل کوفہ بد باطن اور غدار تھے جنہوں نے اپنے اماموں (علی حسن حسین) سے کبھی وفانہ نہیں کی۔

اب امام عالی مقام اہل کوفہ کی دعوت پر سیکڑوں پیغامات وصول کر کے عازم کوفہ ہو رہے ہیں۔ قدم قدم پر انکے ہی خواہ وہاں کے خطرات سے آگاہ کر رہے ہیں۔ اور صاف صاف کہہ رہے ہیں کہ اہل کوفہ غدار ہیں۔ کسی نے یہ نہ کہا کہ یزید آپکا جانی دشمن ہے اسلئے وہاں نہ جائیے۔ یزید کو اپنا نظام حکومت چلانے کیلئے زیادہ سے زیادہ انکی بیعت کی ضرورت تھی اور کم سے کم اس بات کی کہ آپ اسکے خلاف کوئی سازش نہ کریں۔ لیکن حضرت امام والا مقام سازش کرنے والے بھی نہ تھے۔ زیادہ سے زیادہ یہی تھا کہ بیعت سے علیحدہ تھے۔ اور ایک فرد کی بیعت سے کنارہ کش رہنے سے نظام حکومت میں کون سا خلل واقع

ہوسکتا تھا۔ پھر انکے لئے مکہ میں کوئی خطرہ نہ مدینہ میں، اور نہ ہی شام میں کہ جہاں خود یزید موجود تھا۔ تو یہ خطرہ ایک ایسے علاقے میں کیوں پیش آیا جہاں انکے حامیوں کی اکثریت تھی۔

یہ دو تھیلے دعوتی خطوط کے اور وہ اٹھارہ سے تیس ہزار سورما جنھوں نے حسین کی بیعت کی تھی اور انھیں کوفہ آنے کی دعوت تھی۔ اس وقت کہاں تھے جب کربلا کے مقام پر عید اللہ بن زیاد کی بھیجی ہوئی فوج ان پر خونخوار درندوں کی طرح ٹوٹ پڑی تھی۔ کربلا کوفہ سے کچھ اتنا دور بھی نہ تھا۔ آخر وہ عرب تھے، جنگ جو تھے، لڑنا مرنا انکے لئے کوئی بڑی بات نہ تھی، جمل اور صفین میں بھی لڑے تھے اور اسکے بعد بھی لڑتے مرتے رہے۔ اگر لڑ مر نہ سکے تو حسین ابن علی اور خاندان رسالت کی حمایت میں، مکہ و مدینہ کے لوگوں نے تو صرف خیر اندیشانہ مشورہ دیا۔ پوری کوشش سے روکا مگر انکے ساتھ اہل کوفہ کی سازش کا شکار ہو کر قتل ہونے نہ گئے۔ لیکن اہل کوفہ نے بلایا اور بیعت شکنی کی اور قتل کر دیا۔ لہذا ان میں سے غدار اور دشمن حسین کون ہے؟۔

خود حضرت حسین کو جب اہل کوفہ کی غداری اور مسلم بن عقیل کے قتل کئے جانے کی اطلاع ملی تو انھوں نے وہیں سے واپسی کا ارادہ فرمایا تھا۔ لیکن مسلم کے افراد واپسی پر رضامند نہ ہوئے۔ تو آپ نے بھی واپسی کا خیال ترک فرما دیا۔ پھر جب کربلا کے مقام پر پہنچ کر پوری صورت حال سامنے آگئی تو خود حضرت حسین نے یزید سے بات چیت کر کے معاملہ طے کر لینے کی خواہش ظاہر کی تھی جسے کوفہ کے غداروں نے یکسر مسترد کر دیا۔

اہل کوفہ کی ایسی ہی غداری کا مشاہدہ کر کے امام حسن نے انکے علی الرغم معاویہ سے صلح کر لی تھی اور اگر حسین کی خواہش کے مطابق انھیں یزید سے صلح کر بات چیت کا موقع دیا جاتا تو وہ بھی یقیناً کچھ شروط و عہود کے ساتھ یزید کے ساتھ صلح کر لیتے، کیوں کہ ان پر یہ

بات بالکل عیاں ہو چکی تھی کہ انکی حمایت کیلئے کوئی بھی آمادہ نہیں ہے۔ پھر جب کوئی علی اور حسن و حسین کے نہ ہو سکے تو معاویہ اور یزید کے خیر خواہ کب ہو سکتے تھے؟ جب یہ اپنے اما م سے غداری کا الزام اپنے سر لے سکتے تھے تو یزید و معاویہ کی خیر خواہی کب کر سکتے تھے؟ اگر یزید کے خیر خواہ ہوتے تو اسمیں ذرہ برابر کوئی مضائقہ نہ تھا کہ انھیں یزید سے مل کر معاملہ طے کرنے کا موقع دیدیتے۔ یہ کون سی خیر خواہی تھی کہ پورے خاندان نبوت کا سر قلم کر کے یزید کی خلافت کے استحکام کا دعویٰ کیا جائے جبکہ خود یزید بھی یہ جان کر کہ حضرت حسین ان سے مل کر بات چیت کے خواہشمند تھے کافی رنجیدہ ہوا۔ اور عبید اللہ بن زیاد گورنر کوفہ پر بار بار لعنت کے الفاظ دہرائے، بلکہ اسنے یہ بھی کہا کہ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ کوفہ کے لوگ امام حسین کے گرد اپنی سازشوں کا جال بن رہے ہیں تو انکو مع اہل و عیال یہاں اپنے پاس بلا لیتا۔ خواہ اس سے ہمیں کوئی سیاسی نقصان ہی کیوں نہ برداشت کرنا پڑتا۔

یزید کے گھر حسین کی شہادت پر غم منایا گیا۔ اسنے اپنے مکان سے متصل ایک خالی مکان میں حضرت امام کی عورتوں و بچوں کو ٹھہرایا۔ ان کو چند دن عزت کے ساتھ اپنی مہمانی میں رکھا اور پھر پوری عزت و احترام کے ساتھ اپنی سواریوں پر بحفاظت مدینہ منورہ بھجوا دیا۔ بوقت رخصت امام زین العابدین سے کہا: دیکھو مجھ سے برابر خط و کتابت کرتے رہنا کوئی بھی ضرورت پیش آئے مجھے مطلع کرنا۔

حضرت سکینہ اکثر کہا کرتی تھیں کہ میں نے کبھی ناشکر انسان یزید سے زیادہ احسان کرنے والا نہیں دیکھا۔ پوری زندگی یزید آل حسین کے ساتھ حسن سلوک کرتا، اور مدینہ سے جو لوگ آتے ان سے انکی خیریت دریافت کرتا۔

فاطمہ بنت حسین نے کہا: اے یزید! کیا رسول ﷺ کی لڑکیاں کینریں ہو گئیں

؟ یزید نے کہا: اے میرے بھائی کی بیٹی! ایسا کیوں ہونے لگا؟ فاطمہ نے کہا: اللہ کی قسم ہمارے کانوں میں ایک بالی بھی نہیں چھوڑی گئی۔ یزید نے کہا: تم لوگوں کا جتنا گیا ہے اس سے کہیں زیادہ میں تم کو دوں گا۔ چنانچہ جس نے اپنا جتنا نقصان بتایا اس سے دو گنا تین گنا ہر ایک کو دیا گیا۔

اب حسین و آل حسین کہ جن کے ساتھ یہ واقعات پیش آئے خواہ اہل کوفہ کے ناپاک عزائم سے وہ یکسر بے خبر رہے ہوں لیکن یہ سلسلہ مظالم ان پر گزر جانے کے بعد کیا اب تک وہ اس بات سے غافل تھے کہ دراصل قاتل لوگ کون تھے اور انکے ناپاک عزائم کیا تھے؟ ظاہر ہے کہ اگر ان کی نظروں میں قصور و اربذات خود یزید ہوتا اور وہ اس قتل و خون ریزی کا ذمہ دار اسی کو سمجھتے تو آل حسین کی مثالی غیرت انھیں ہرگز اس بات کی اجازت نہ دیتی کہ یزید کے مہمان خانہ پر بیٹھ کر کان کی بالیوں جیسی حقیر چیزوں کا اس سے مطالبہ کریں۔ ایسا مطالبہ تو کسی ایسے ہی شخص سے ممکن تھا جسے وہ اپنا نمگسار اور خیر خواہ سمجھتے ہوں۔ اور پھر بی بی سکینہ کا ہمیشہ اسکے سلوک و احسان کا تذکرہ اپنی زبان پر لاتے رہنا خود اس بات کا ثبوت تھا کہ یزید ان کی نظروں میں قاتل حسین نہ تھا۔ آل حسین ہفتہ دس روز یزید کی مہمانی میں رہے یزید اور اسکے خاندان کی عورتیں جس طرح آل حسین کے غم میں برابر کی شریک رہیں اور پھر جس طرح انکی وہاں خاطر و مدارات ہوئی اور نہایت عزت و احترام کے ساتھ یزید کے افراد خاندان انکے ساتھ پیش آئے اور خود درد و حسرت سے یزید کا بار بار عبد اللہ بن زیاد اور قاتلین حسین پر لعنت کرنا، برابر اپنے ساتھ زین العابدین کو اپنے دسترخوان پر بٹھا کر دونوں وقت کھانا کھلانا یہ ساری باتیں ان کی نظروں میں تھیں۔ پھر حسین کی یزید سے مل کر بات چیت کرنے اور مسئلہ کو طے کرنے کی خواہش جسے ظالموں نے یکسر مسترد کر دیا، حالانکہ اگر یہ بات ایک طرف حسین کے حق میں تھی کہ انھیں اس مصیبت کا

سامنا نہ کرنا پڑتا تو اس سے کہیں بڑھ کر خود یزید کے حق میں تھی کہ اس کا عہد حکومت آل رسول کے خون سے بری رہتا۔ لہذا ابن زیاد نے، عمرو بن سعد نے یا شمر اور اسکے ساتھیوں نے جو کچھ مظالم محض اپنی شیطنت سے فتنہ پردازی کیلئے کئے اس سے یزید کی حکومت کا فائدہ ہوا یا اسکی بنیادیں ہل گئیں؟ یہ مقتولین کر بلا کے سر نیزوں پر اٹھائے ہوئے شغال زادے جو کر بلا سے کوفہ اور کوفہ سے شام تک دوڑے تاکہ یزید کی خوشنودی حاصل کریں اور انعام و اکرام سے نوازے جائیں۔ انھیں یزید کی جانب سے صرف لعنت کے جوتے دئے گئے۔ سبائیت نے یہاں بھی ایک تیر سے دو شکار کئے:

۱۔ خاندان نبوت کا خاتمہ ۲۔ اور یزید کی رسوائی کا سامان

قاتلین حسین پر اللہ کی ابد تک لعنت ہوتی رہے خواہ وہ کوئی ہو جس کا ادنیٰ اشارہ یا اسکی رضوان کے قتل میں شامل ہو۔ اس پر اللہ کی ہزار بار لعنت ہو۔ لیکن ایک دیا نتردار مؤرخ جو صرف آنکھیں بند کر کے سبائیت کا راگ نہ الاپ رہا ہو تاریخ کی روشنی میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ خونِ ناحق جو سر اسر یزید کی مصالح کے خلاف تھا خود یزید کے حکم یا اسکی اجازت و رضایا اسکے کسی ادنیٰ اشارے پر بہایا گیا ہو۔ ایسا کسی شیعہ تاریخ سے بھی ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن سبائیت آج تک اپنے گریہ و ماتم اور سینہ کوبی کے ساتھ دنیا کو باور کرانا چاہتی ہے کہ یزید ہی ان تمام واقعات کر بلا کا ذمہ دار تھا۔ لہذا اس پر لعنت بھیجنا ضروری ہے اور پھر خلافت یزید کی ذمہ داری معاویہ پر اور معاویہ کی ذمہ داری عثمان و عمر پر اور عمر کی ذمہ داری ابوبکر پر ڈال کر اس پورے سلسلہ خلافت پر لعن طعن کا بازار گرم کیا جاتا ہے۔ یہ تو سبائیت کی اس شاخ کا کارنامہ ہے جسے رافضیت کا نام دیا جاتا ہے اور اسکی دوسری شاخ خارجیت نے تو علی اور انکے تمام اہل بیت کو میکسر کافر و مرتد قرار دیا اور انکو واجب القتل ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ نعوذ باللہ! خوارج نے جب علی کے خلافت بغاوت کی



تو انھیں قتل عثمان کی سازش میں بھی شریک ٹھہرایا۔ استغفر اللہ! معاویہ کو تو پہلے سے کافر قرار دے چکے تھے لیکن اس کے بیٹے یزید پر اتنے مہربان ہوئے کہ اسے ابو بکر و عمر سے بھی افضل خلیفہ قرار دیدیا۔ اور معاذ اللہ! حضرت حسین کو باغی اور واجب القتل گردانا۔ یہ رہی سبائیت کی دوسری شاخ یعنی خارجیت۔

بس سبائیت کی یہی دونوں شاخیں مل کر صحابہ و اہل بیت سب کو کافر و مرتد قرار دے کر پورے دین و ایمان و اسلام و قرآن کی نفی دیتی ہیں اور یہودیت کا یہی مقصد ہمیشہ سے رہا ہے ﴿وَقَالَتْ طَّائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمَنُوا بِالَّذِي أُنزِلَ عَلَيَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَجَهَ النَّهَارِ وَكُفِرُوا آخِرَهُ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ﴾ (آل عمران: 72) ”ایمان لاؤ اس کتاب بر جو اہل اسلام پر اتاری گئی دن کے ابتدائی حصہ میں اور دن کے آخری حصہ میں اسکے منکر ہو جاؤ تا کہ اہل اسلام اپنے دین سے برگشتہ ہو جائیں“۔

پس اسی آیت کے بمصداق عبداللہ بن سبأ یہودی حضرت عثمان کی خلافت میں داخل اسلام ہوا اور صوبہ شام کے علاوہ ایک ایک صوبہ میں اپنی سازشی مراکز قائم کئے۔ اور حضرت عثمان سے لیکر امام حسین تک ایک ایک امام و خلیفہ کو قتل کر دیا۔

حضرت عثمان کے عہد میں انکی خلافت کو اکھاڑنے کیلئے مسلمانوں میں یہ مطالبہ عام کیا گیا کہ خلافت رسول کے اصل حقدار بنو ہاشم ہیں۔ لہذا امویوں کو خلافت کا کوئی حق نہیں۔ اگر بات یہی تھی تو امویوں کے بعد جب عباسیوں کی خلافت کا دور شروع ہوا تو انکا یہ مطالبہ پورا ہو گیا تھا۔ کیوں کہ بنو عباس بنو ہاشم ہی تھے۔ لیکن اب سبائیوں نے ایک نیا شوشہ چھوڑا کہ خلافت کے اصل حقدار بنو فاطمہ ہیں۔ لہذا عباسی خلفاء بھی بنو فاطمہ کے حق کے غاصب ہیں۔ لہذا اب عباسی خلافت کے خلاف انکی ریشہ دوانیاں شروع ہو گئیں۔ ان

ہی دنوں ان میں ایک فرقہ باطنیہ پیدا ہوا جس نے ظاہر شریعت کی کلینگی کر دی۔ اور عیش و عشرت و اباحت کا دروازہ دوپٹ کھول دیا۔ ان میں ایک شخص حسن بن صباح نکلا جس نے مصنوعی جنت بنوائی جس میں وہ لوگوں کو نشہ کی حالت میں داخل کراتا اور وہاں کے حور و غلمان سے ہم آغوش کرا کے دوبارہ نشہ کی حالت میں چند روز بعد جنت سے باہر کرا دیتا تھا۔ اور پھر ان طالبان جنت سے اس کارپردازان کی قربانیوں کے عوض جنت کا سودا کرتے اور عباسی خلفاء کو اس طرح قتل کرا دیتا تھا۔

اس طرح خلفاء بنو عباس کا قتل حسن بن صباح کی جنت کی قیمت تھی لیکن عباسی خلفاء بڑے زبردست تھے۔ انہوں نے اس فتنہ کو نیست و نابود کرا دیا تو آخری چارہ کار کے طور پر عباسی خلافت کی بیخ کنی کیلئے ہلاک خواں تاتاری کو بغداد تاراج کرنے کیلئے دعوت دی گئی۔ خلیفہ مستعصم باللہ کے دو انتہائی قابل وزیر تھے جو خود کو شیعیان علی کہتے تھے۔ شیعیان علی سے کسے پرہیز ہو سکتا تھا۔ جسے علی سے لگاؤ تھا اسے شیعیان علی سے بھی الفت تھی لیکن وہ صرف نام کے شیعیان علی تھے۔ دراصل وہ سبائی تھے جو تفتیہ کے طور پر خود کو شیعیان علی ظاہر کرتے تھے۔ وہ تھے نصیر الدین طوسی اور ابن علقمی۔ ان دونوں سبائیوں نے ہلاک خواں کو بغداد تاراج کرنے کی دعوت دی تھی۔ اور بغداد کا اتنا مکمل نقشہ رومال پر بنا کرا تاتاری افواج کی رہنمائی کیلئے بھیجا گیا تھا کہ جس میں بغداد کی ایک ایک گلی و کوچہ کو دکھایا گیا تھا۔ اور اسکی قیمت تاتاریوں سے صرف یہ چاہی گئی تھی کہ مصر میں کچھ دنوں کیلئے بنو فاطمہ کی حکومت قائم ہو جائے۔

چنانچہ ان کی سازشوں سے عباسی خلافت کا نام و نشان صفحہ ہستی سے مٹ گیا۔ تمام بغداد خون میں غرق کرا دیا گیا۔ تمام عباسی امراء و علما کو جام شہادت نوش کرا پڑا۔ دریائے دجلہ مسلمانوں کے خون سے سرخ ہوا تو دریائے فرات جلی ہوئی اسلامی کتب

خانوں کی سیاہی سے سیاہ ہو گیا تھا۔ قیامت برپا تھی اور کسی کو کسی بات کا ہوش نہ تھا۔ مگر اس بات کا سب کو ہوش تھا کہ بغداد کے درو دیوار پر لکھ دیا گیا تھا کہ: ”اللہ اس شخص پر لعنت کرے جو ابنِ علقمی پر لعنت نہ کرے۔“

اس خون ریزی کے عوض صرف دو ڈھائی سال تک مصر میں بنو فاطمہ کی نام نہاد خلافت قائم کر دی گئی جو بعد کو ختم کر دی گئی۔ لہذا تمام تر لعنتیں یہود کی اس سازشی ایجنسی (سبائیت) پر ہوں جن کی گردنوں پر تمام خلفائے اسلام کا خون ہے۔ معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا۔ ترکوں نے عربوں سے تو عنانِ حکومت چھین ہی لی لیکن ایک صدی کے اندر وہ خود داخل اسلام ہو کر اسلام کے جھنڈے تلے تقریباً سات سو سال تک اسلام، قرآن، کعبہ و قبلہ اول کی حفاظت کرتے رہے۔ اور تمام باطل طاقتوں اور صلیبی قوتوں کا تنہا مقابلہ کرتے رہے۔ انھوں نے پورے چار صدیوں تک دنیا بھر کے مسلمانوں کو حفاظت اسلام کی ذمہ داریوں سے فارغ کر دیا تھا۔ اور تنہا تمام باطل محاذوں پر ڈٹے رہے۔ اور ایک ایک دشمن طاقت سے اپنا لوہا منواتے رہے۔ پھر انکا بھی زوال آخر یہود و نصاریٰ کی سازشوں سے ہی ہوا۔ جنھوں نے عربوں کو خلافت کا حقدار قرار دے کر ترکوں کے مقابل کھڑا کیا اور صلیبی قوتوں کی تائید و حمایت سے عثمانی خلافت کا خاتمہ کرایا۔ اور تمام عرب ممالک کو عثمانیوں سے آزاد کرا کے انھیں چھوٹی چھوٹی تیرہ ریاستوں میں تقسیم کر دیا۔ اور عربوں کو لے جا کر انھیں صلیبی طاقتوں کی گود میں بٹھا دیا۔ ۱۹۴۶ء میں ان کے قلب میں اسرائیلی ریاست کا نجنر پیوست کر دیا تاکہ اگر کوئی حرکت ہو تو وہیں سے عربوں پر ضرب کاری بھی لگائی جاسکے۔ وہ آج تک اپنے ہاں نظام خلافت کے دوبارہ احیاء سے عاجز و قاصر ہیں۔ غالباً امیر فیصل مرحوم نے اس بابت کچھ سوچا ہی تھا کہ ان کو بھی فوراً آڑے ہاتھوں لے لیا گیا۔ ہاں اسپین کی آٹھ سو سالہ خلافت کے زوال کا سبب مؤرخین شیعوں کی سازش کا عمل دخل مانتے ہیں

لیکن دراصل وہ شیعہ نہیں بلکہ وہ سہائی تھے۔ شیعیت کا لبادہ انھوں نے ہردور میں اپنے اوپر رکھا تا کہ ان سازشی عزائم پر کسی مسلمان کی نگاہ نہ پڑ سکے۔ حتیٰ کہ ہندوستان میں مغل حکومت کے اسباب زوال میں سب سے بڑا سبب گولکنڈہ کی شیعہ ریاستوں کی بغاوت اور میرصادق و میرجعفر کی غداری کو قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن آج تک یہ بدباطن طبقہ محرم الحرام کے موقع پر سال بہ سال اپنے گریہ و ماتم اور سینہ کوبی کے شور و ہنگامہ میں یہی کہتا چلا آ رہا ہے کہ علی اور آل رسول پر مظالم خود مسلمانوں کے ہاتھوں ہوئے ہیں۔

ابھی آٹھ سال کی بات ہے کہ آیت اللہ خمینی وارد ایران ہوئے تو ان کا دعویٰ تھا کہ وہ حضرت علی کے طرز کی خلافت قائم کریں گے۔ انھوں نے خود کو امام زماں کہلوا دیا اور اللہ اکبر خمینی رہبر کے نعرے لگوائے اور اپنے فوٹو (تصاویر) اس کثرت سے ایران اور بیرون ایران پھیلانے کے انکے عقیدتمندوں نے گویا اسے جلبِ منفعت اور دفعِ مضرت کے لئے ایک تعویذ بنا رکھا ہے۔ انھوں نے بیک زبان امریکہ و اسرائیل و روس کو درجہ اول کا اسلام دشمن ٹھہرایا۔ اور چھوٹے بڑے شیاطین قرار دیدیا۔ لیکن آج پورے آٹھ سال سے ان کی جو جنگ ایک پڑوسی ملک عراق سے جاری ہے وہ کس مقصد سے ہے؟

شاہ ایران اگرچہ امریکہ نواز تھا لیکن اسکے زمانہ میں ایران فوجی و اقتصادی اعتبار سے کافی طاقتور اور مضبوط تھا۔ اور آج ایران علیؑ کے طرز پر خلافت کا دعویٰ کر کے خود بھی ویران ہو چکا ہے اور عراق کو بھی تباہ و برباد کر چکا ہے۔ جنگ کی ابتدا تو عراق کی طرف سے ہوئی تھی۔ لیکن از ابتدا تا امروز جب جب مصالحت کی کوشش کی گئی تو ہمیشہ عراق نے مثبت رویہ اختیار کیا۔ اور ایران نے منفی رویہ اپنایا۔ اور خلیفہ چہارم کے نائب کا حال یہ ہے کہ وہ کسی بھی ایسے عرب ملک کو مسلمان تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں جو انکے موقف کا حامی نہ ہو۔ ان کا کھلا عزم یہ ہے کہ حرمین شریفین اور نجف اشرف کو فتح کر کے دنیا میں عدل

حقیقی کا قیام عمل میں لائیں گے اور یہ عدل حقیقی اس وقت تک دنیا میں قائم نہیں ہو سکتا جب تک کہ روضہ نبی پاک ﷺ سے شیخین (ابوبکر و عمر) کی تربت کو علیحدہ کر کے انکی جگہ حسن و حسین کی تربت کو عراق سے لا کر رکھ نہ دیا جائے۔ اور اسکے لئے عراق و حجاز دونوں کا فتح کرنا ضروری ہے۔ امام زماں کو امام زماں اور نائب خلیفہ چہارم بننے کیلئے عراق و حجاز دونوں کی ضرورت ہے۔ حجاز کی تو اسلئے کہ وہ اسلام کا مرکز ہے اور عراق کی اسلئے کہ وہ علی کا دار الخلافہ تھا۔ لہذا اب وہ عراق پر غلبہ کی کوششوں کے ساتھ حرم پاک پر بھی دست درازی کی ابتدا فرما چکے ہیں اور ایران کے حجاج اُس حج کیلئے نہیں جاتے جو عبادت ہے اور ارکان دین سے ہے، بلکہ سیاسی حج کی غرض سے جایا کرتے ہیں۔ اسمیں حج کے تلبیہ کے ساتھ امریکہ مردہ آباد اور اللہ اکبر خمینی رہبر پکارنا ضروری ہے۔ لیکن سعودی حکومت کے لوگ ظالم ہیں جو انھیں سیاسی حج سے روکتے ہیں۔

سننے میں آیا ہے کہ امسال ایرانی حجاج آستینوں میں خنجر چھپا کر لے گئے تھے اور جب انھیں ایسے نعروں سے پولیس کے محافظ دستے نے روکا تو وہ ان پر ٹوٹ پڑے۔ اور تقریباً ۸۰-۸۵ افراد کو خنجر گھونپ کر ہلاک کر دیا۔ اور پھر کس خوبصورتی سے اسکا رد عمل امریکہ کے خلاف ظاہر کیا ہے، گویا سعودی حکومت کی پولیس نے اپنی حفاظت کیلئے فائرنگ کی تو اسمیں بھی امریکہ کی سازش کا دخل تھا۔ ورنہ وہ صرف مارکھاتے اور ہاتھوں پر رائی جمائی بیٹھے رہتے۔

آخر جب تمام بڑی طاقتیں شیطانی طاقتیں ہیں اور ایران اسلحہ سازی میں خود کفیل بھی نہیں ہے تو یہ کثیر اسلحہ جو عراق سے اسکی جنگ میں صرف ہو رہا ہے کہاں سے آرہا ہے؟ ہندو پاكستان کے مابین صرف سترہ دن کی جنگ میں دونوں ملکوں کی ساری آتش بازی جل کر خاکستر ہو گئی۔ اور جنگ کو آگے بڑھانے کی طاقت کسی میں نہ رہی۔ لیکن آج ان دونوں

ملکوں میں آٹھ سال سے خون ریز جنگ جاری ہے اور پھر بھی اس جنگ کو آگے بڑھانے میں کسی شیطانی طاقت کا ہاتھ نہیں ہے۔؟ یہ بات محلِ غور ہے تقریباً آج سات ماہ کی مدت ہوئی میں نے رابطہ میں اعلیٰ ایران کی معرفت ایرانی رہنماؤں اور خاصکر خمینی صاحب کو لکھا تھا کہ آپ کی حیثیت ایک عالمِ دین کی ہے اور آپ اصلاحِ امت کے لئے اٹھے ہیں، تو ایسی جنگ آپ کے شایانِ شان نہیں جو سراسر مسلمانانِ عالم کے مفاد کے خلاف اور دشمنانِ اسلام کے مفاد میں ہو۔

لہذا آپ یکطرفہ طور پر اس جنگ کو روکنے کا اعلان کریں پھر صدام حسین کی مجال کیا ہے کہ جنگ بندی میں پس و پیش کرے۔ اس کا جواب تو مجھے موصول ہوا لیکن اس سے میں بالکل مطمئن نہ ہوا وہ محض ایک عذر تھا۔

پھر میں نے لکھا تھا کہ علی کی جانشینی کا دعویٰ صرف ایسے ہی شخص کو زیب دیتا ہے جو علی جیسا بے نفس انسان ہو کہ دشمنانِ اسلام کو قتل کرتے وقت اگر نفس کے انتقام کو دخل ہو جاتا تو دشمن کے سینے سے اتر کر ایک طرف کھڑے ہو جاتے۔ اور امامِ زماں وہ ہوگا جو صرف امتِ محمدی و ملتِ ابراہیمی کا ایک فرد ہوگا۔ وہ کسی شیعہ سنی کیمپ سے نمودار ہونے والا فرد نہ ہوگا۔

میں نے مذکورہ بالا سطور میں جس فتنہ سہائیت کا بار بار تذکرہ کیا ہے اس کی بابت رابطہ والوں نے مجھے لکھا تھا کہ آپ بلاوجہ ایک افسانوی شخصیت کا ذکر بار بار دہراتے ہیں تو اس کے جواب میں میں نے لکھا تھا کہ عبداللہ بن سبا، یمنی یہودی افسانوی شخصیت نہیں ہے بلکہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔ چنانچہ تاریخِ طبری سے کئی صفحات مسلسل نقل کر کے ارسال کئے تھے جس میں عبداللہ بن سبا کا داخل اسلام ہو کر اپنے تخریبی پروگرام کے لئے ایک صوبہ میں مراکز قائم کرنے اور اس کے بعد کے بڑے بڑے فتنوں کا ذکر پوری

تفصیل سے موجود ہے۔ قتل حسین تو تاریخِ خلافت یزید کا ایک واقعہ ہے لیکن سبائیت کی تباہ کاریوں سے پوری اسلامی تاریخ بھری پڑی ہے۔ اعتقادی و عملی سطح پر اس گروہ نے سب سے زیادہ نقصان شیعہ فرقہ کو پہنچایا۔ ان کو ۳ فرقوں میں تقسیم کر دیا اور ایسے ایسے مسائل و عقائد ان میں دین کے نام سے پھیلانے کے جسے دین حق کی تخریب ہی کا نام دیا جاسکتا ہے۔ متعہ دورِ جاہلیت میں سماجی عقد کی ایک شکل تھی۔ جب تک قرآن میں اس کی ممانعت کی آیت نازل نہ ہوئی بعض اصحاب رسول نے بھی اس کی اباحت کا فائدہ اٹھایا۔ لیکن کیا صحابہ و اہل بیت نے یہ عمل خود نہیں کیا۔ اور جب آیتِ حرمت نازل ہوئی تو اس کی حرمت کا اعلان کر دیا گیا جیسے شراب کہ وہ حلال کر کے دوبارہ حرام نہیں کی گئی تھی بلکہ وہ نزولِ حرمت سے پہلے اباحتِ اصلیہ پر تھی۔ جسے اکثر صحابہ نوش کر لیتے تھے لیکن کبار صحابہ اور اہل بیت اس سے بھی اجتناب کرتے تھے۔ تو آج اگر متعہ کی بابت شیعہ و سنی میں کوئی اختلاف ہو سکتا ہے تو صرف اسی دائرے میں ہونا چاہیے کہ وہ آج بھی جائز ہے یا اس کا جواز ختم ہو گیا۔ کیونکہ وہ سماجی نکاح کی ایک گھٹیا شکل تھی۔ ہر شخص خود کو فخر سے نکاح سے پیدا شدہ کہہ سکتا تھا۔ لیکن متعہ سے پیدا شدہ کہلانے میں ہمیشہ عار محسوس کی گئی ہے۔ لیکن یہ شیعیت کے دین و مذہب میں سبائیت کی تخریب کاری نہیں تو اور کیا ہے؟

(ومن تمتعَ مَرَّةً وَاحِدَةً فدرجته كدرجة الحسن، ومن تمتعَ مَرَّتَيْنِ فدرجة الحسين، ومن تمتعَ ثلاثَ مرات فدرجته كدرجة علي، ومن تمتعَ أربعَ مرات فدرجته كدرجة النبي صلي الله وعلیه وسلم )

”جو ایک بار متعہ کرے وہ حسن کے مرتبہ کو پالے اور جو دو دفعہ متعہ کرے تو وہ حسین کے درجہ پر فائز ہو اور جو تین مرتبہ متعہ کرے وہ علی کی منزلت کو پاوے اور چار مرتبہ متعہ کرے وہ نبی

صلی اللہ علیہ وسلم کے درجہ پر پہنچ جائے، نعوذ باللہ من ذالک

اس سے بڑا کفر نبی پاک ﷺ کے ساتھ اور اہل بیت نبی کی اس سے بڑھ کر تحقیر و تذلیل اور کیا ہو سکتی ہے جو اس شیعہ روایت سے ثابت ہوتی ہے۔ ابھی حال میں ایران کے ایک عالم نے بھی متعہ کی بابت ایسے ہی وہی خیالات کا اظہار کیا ہے کہ گویا وہ سارے فضائل و محاسن کا سرچشمہ ہے اور تقیہ یعنی دین کو چھپانا، اور دین میں مصلحت آمیز جھوٹ بولنا تو وہ دین کے دس حصوں میں سے نوحہ دین قرار دیا گیا۔ گویا اب شیعہ فرقہ کی دینی روایات کا کوئی اعتبار ہی نہ رہا۔ لاجول و لا قوہ الا باللہ العلی العظیم

دنیا کا کوئی ایسا مذہب نہیں جس میں جھوٹ بولنا عبادت ہو اور جس میں اس دین کو اظہار کے بجائے انفاء کی اجازت ہو لیکن اہل تشیع کے دین کو سبائیوں نے اس طرح مسخ کر کے رکھ دیا کہ اس میں اسے دس حصوں میں سے نوحہ دین قرار دیا گیا ہے۔ یہ تمام تصریحات جب میں نے علماء ایران کو لکھ بھیجیں تو وہ بالکل خاموش رہے اور کسی ایک بات کا انکار نہ کر سکے۔

### اہل سنن کا اغواء

نوابین اودھ کے دور میں جب شیعہ فرقہ کے لوگوں کے پاس بڑی بڑی ریاستیں اور جاگیریں تھیں انھوں نے حمایت حسین و آل حسین کے نام پر سنی حضرات کا اغوا کیا اور انھیں محرم میں تعزیہ داری میں شرکت کی دعوت دی۔ لیکن تعزیہ داری کے اس ڈرامے میں شیعوں نے اہل سنن کو وہ تمام رول سونپے جو قاتلین حسین کے تھے۔ اور وہ تمام رول خود اپنے لئے چن لئے جو حسین کے سوگوار کے لیے۔ اور اس طرح دنیا پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی قاتل حسین دراصل اہل سنن ہی ہیں۔

### تعزیہ سازی



یہ کام سنی مسلمانوں کی رنگریز برادری کے سپرد کیا کہ وہ تعز یہ یعنی قبر حسین اپنے ہاتھوں سے بنائیں کیوں کہ حسین کے قاتلوں ہی نے ان کی نعش کو سپرد خاک کیا تھا۔

### نقارہ جنگ

یہ نقارہ جنگ سنی دفالی برادری سے محرم میں بجوایا گیا جب کہ کربلا میں طبل جنگ بجانے والے حامیانِ حسین نہ تھے بلکہ قاتلینِ حسین ہی تھے۔

### فوجی مارچ

اکھاڑے کے سنی ان پڑھ پہلوانوں کو تلواروں، نیزوں اور لٹھیوں کا اکھاڑا نکالنے کی پیش کش کی گئی جس کو انھوں نے نادانی سے قبول کر لیا۔ حالانکہ یہ عبداللہ بن زیاد کی بھیجی ہوئی فوج کی نقالی تھی۔

### جلوس میں سنی خواتین کی شمولیت

شیعہ عورتیں تو محرم کے ایام میں ترک زینت اور ماتمی سیاہ لباس پہن کر اپنے گھروں کی چہار دیواریوں میں محصور ہو جاتی ہیں۔ اور سنی خواتین ریشمی لباس زیب تن کر کے تعز یہ کے جلوس میں حلیم، کباب، پراٹھے اور کھچڑا کھاتی پھرتی ہیں حالانکہ ان کے اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان صاحب نے اس سے سختی سے منع فرمایا ہے۔

### سنی علماء کے مواعظ

سنی علماء محرم میں بڑی رقت انگیز انداز سے داستانِ کربلا اور واقعہ شہادت سناتے ہیں اور یزید پر سب و شتم کرنے اور صحابہ کرام پر نادانستہ کچھڑا اچھالنے میں شیعہ علماء سے بھی مسابقت کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کا موقف صحابہ و اہل بیت دونوں ہی سے محبت و عقیدت کا ہے۔ یزید کو یزید پلید کہہ کر وہ گویا محبتِ اہل بیت کا حق ادا کرتے ہیں لیکن وہ اتنا بھی نہیں سوچتے کہ یزید کو خلیفہ بنانے والے معاویہ ہی ہیں جو صحابی رسول اور کاتبینِ وحی

میں سے تھے۔ کیا اللہ کو ان کے بعد کے حالات کا علم نہ تھا کہ بذریعہ وحی اپنے نبی کو منع فرمادیتا کہ معاویہ سے قرآن کی کتابت نہ کروائیں، نیز یزید کی بیعت کرنے والوں میں صحابہ کی ایک خاصی تعداد بھی ہے جنہوں نے اس کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کی تھی۔

یزید کیسا شخص تھا کہ اس کا اندازہ آج ہم سبائی روایات کی روشنی میں کر رہے ہیں اور وہ بھی چودہ صدیوں کے بعد لیکن کبار صحابہ جیسے ابن عمر، ابن عباس وغیرہ، کیا وہ اس کے ذاتی حالات سے اتنے بھی واقف نہ تھے جتنے آج ہم اپنے آپ کو سمجھ رہے ہیں۔ امیر بننے والے کی تو اپنی غرض ہوتی ہے کہ انتہائی نااہلی کے باوجود اس کی تمنا کر سکتا ہے لیکن ان اصحاب رسول کو کیا ہوا جنہوں نے کسی اور کی امارت کی خاطر اپنی عاقبت کا سودا کرنا ناگوار کر لیا۔

لہذا ہم اپنی جانب سے نہ تو ہم اس پر تنقید کرنا چاہتے ہیں اور نہ تائید بلکہ اس آیت قرآنی کی روشنی میں اس کا معاملہ رب علم و بصیر کے حوالے کرتے ہیں۔

﴿تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا

تَسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ (البقرة: 134)

”یہ ایک جماعت تھی جو گذر چکی اس کے نیک و بد کی تمام تر ذمہ داری انہیں پر ہے۔“

اور تم سے ان کے اعمال کی بابت سوال نہ کیا جائیگا۔“

ہاں وہ مسلمان انتہائی قابل ملامت ہیں جنہوں نے حسین سے ہر طرح کا

عہد و میثاق کیا اور پھر ان کی مدد کو نہ پہنچے اور ظالموں کے ہاتھوں انہیں شہید کرادیا۔

یہ شہر بمبئی ایک مدت دراز سے سنی و شیعہ علماء کی مرثیہ خوانی و عزاداری کے

مقابلوں کا اکھاڑا بنا ہوا پیشہ ورنوہ خواں اور عزادار علماء و شعراء کی اس شہر میں بڑی آؤ بھگت

ہوتی ہے بعض شعلہ بیاں سنی مولوی صاحبان جو یزید کو گالیاں دینے میں اپنا جواب نہیں

رکھتے یہاں کے شیعہ عوام کی طرف سے بھی بڑے اعزاز و اکرام کے مستحق بننے ہیں۔ اور پھر فخر سے کہتے ہیں۔

اس طرح کہتے ہیں سنی داستانِ اہلبیت

یعنی داستانِ اہلبیت اور واقعاتِ کربلا خود اہلبیت کے ذکر کردہ واقعات کے بالکل برعکس بیان کئے جاتے ہیں۔ اور سبائیت کی ہمنوائی کا پورا پورا حق ادا کر دیا جاتا ہے خواہ اس کی نذر جا کر اصحابِ رسول پر پڑے یا خود اہلبیت پر۔

میری شیعہ و سنی بھائیوں سے گزارش ہے کہ اگر واقعی انھیں اہلبیت سے محبت و عقیدت ہے تو تمام اصحابِ رسول اور معاویہ کی بابت وہی موقف اختیار کریں جو خود اہلبیت کا تھا۔ اور سبائیت کے انہما سے خود کو آزاد کرنے کی صورت پیدا کریں جس کا اگر ایک وار اصحابِ رسول پر ہے تو دوسرا اہلبیت پر۔

اللہ تعالیٰ ہم سب مسلمانوں کو اہل بیت اور اصحابِ رسول کے نقشِ قدم کی پیروی کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

والسلام

حکیم ابوالحسن عبید اللہ خاں رحمانی

۱۰ محرم الحرام ۱۴۰۷ھ

يوم عاشوراء يوم الفرع أم الحزن؟  
( باللغة الأردية )

تأليف

شيخ الحديث العلامة ابو الحسن عبيد الله الرضائي البار كفوري رحمه الله

مراجعة

شفيق الرحمن ضياء الله المدني

الناشر

المكتب التعاوني للدعوة والارشاد وتوعية الجاليات بالربوة  
الرياض- المملكة العربية السعودية

[Islamhouse.com](http://Islamhouse.com)